

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ماہنامہ
جہاد

السنۃ



شمارہ ۱۲۳۰ھ تا ۱۴۲۹ھ



غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری



- مانعین رفع الیدین کے دلائل کا علمی محاسبہ
- نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں ایک سنتِ مظلومہ
- صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہیہ انکارِ حدیث
- لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجْعَلَ بِهِ ۝ کی تفسیر
- کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں

دارالافتاء والفتویٰ، جہلم، پاکستان



اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

الامام الحنفی قوام السلف ابو القاسم اسماعیل بن محمد الاصہبانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۴۵ھ) لکھتے ہیں:

”بعض علمائے کرام کا کہنا ہے کہ بنیادی باتیں سات ہیں، جن کی وجہ سے فرقے گمراہی کا شکار ہوئے ہیں:

① ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں موقف ② صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں موقف ③ افعالِ باری تعالیٰ کے بارے میں موقف ④ اہمیت کے بارے میں موقف ⑤ ایمان کے بارے میں موقف ⑥ قرآنِ کریم کے بارے میں موقف اور ⑦ امامت کے بارے میں موقف
چنانچہ اہل تشبیہ ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں، جنہی صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں، قدری افعالِ باری تعالیٰ کے بارے میں، خارجی (گناہوں پر وعید) کے بارے میں، مرجئی ایمان کے بارے میں، معتزلی قرآن کے بارے میں اور رافضی امامت کے بارے میں گمراہ ہو گئے ہیں۔

اہل تشبیہ اللہ تعالیٰ کی مثال مانتے ہیں، جنہی اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا انکار کرتے ہیں، قدری خیر و شر دونوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں مانتے، خارجی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمان کبیرہ گناہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے، مرجئی کہتے ہیں کہ عملِ ایمان میں داخل نہیں اور کبیرہ گناہ کا مرتکب (مبین) مؤمن ہوتا ہے، نیز ایمان میں کمی و بیشی نہیں ہوتی، رافضی اجسام کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے، وہ قیامت سے پہلے دنیا میں تشریف لائیں گے، جبکہ ناجی (نجات پانے والا) گروہ اہل سنت والجماعت، اصحاب اللہ بیٹ ہیں اور وہی سوادِ اعظم ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے ناجی گروہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی اس بات میں شک نہیں کرتا کہ ناجی گروہ اللہ کے دین پر کار بند ہوگا اور اللہ کا دین وہ ہے جو قرآن میں نازل ہوا اور سنت رسول نے اس کی توضیح و تشریح کی، اہل سنت کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ایک ہے، ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۷) (اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب سے بصری ہے) موجودات میں سے کوئی بھی چیز کی بھی طرح سے اس کے ساتھ شریک نہیں، کیونکہ اگر کوئی اس کا شریک ہو تو جس میں وہ شریک ہے، اس میں اس کا ہم مثل ہوگا، اللہ تعالیٰ کا صرف وہ نام رکھا جائے گا، جو اس نے خود اپنی کتاب میں اپنے لیے رکھا ہے یا اس کے رسول نے اس کا نام رکھا ہے اور امت نے اس پر اجماع کیا ہو (یعنی وہ مشابہات میں سے نہ ہو) یا امت نے اس نام پر اجماع کیا ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو صرف اسی صفت کے ساتھ موصوف کیا جائے گا جو اس نے خود یا اس کے رسول ﷺ نے بیان کی ہے یا اس پر مسلمانوں نے اجماع کیا ہو۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت اس کے علاوہ بیان کرے، وہ گمراہ ہے، ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قدرت والا، علم والا، زندہ، سننے والا، دیکھنے والا، کلام کرنے والا، زندگی دینے والا اور موت دینے والا ہے، نیز اس کے لیے قدرت، علم، حیات، سمع، بصر، کلام، ارادہ وغیرہ صفات ہیں، وہ ان تمام صفات کے ساتھ ہمیشہ سے موصوف ہے، اس کی کوئی صفت حادث نہیں، تمام فرقے اگرچہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین پر کار بند ہیں، لیکن انہوں نے دین میں بدعات نکالی ہوئی ہیں اور وہ فتنہ و تاویل کی تلاش میں مشابہات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جبکہ اہل سنت والجماعت نے کتاب و سنت اور سلف صالحین کے اجماع سے تنہا و تنہا نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے فتنہ و تاویل کی تلاش میں مشابہات کی پیروی کی ہے، انہوں نے تو صرف صحابہ و تابعین اور بعد والے مسلمانوں کے اجماع کی تولاً و فعلاً پیروی کی ہے۔

جن (عقائد) کے بارے میں مسلمانوں کا اختلاف ہے اور ان کی کتاب و سنت میں کوئی اصل نہیں، نہ ہی امت کا ان پر اجماع ہے، وہ بدعت ہیں اور اس فرمانِ رسول ﷺ کے مصداق ہیں: ”من أحدث فی أمرنا ما لیس منہ، فهو ردّ۔“ ”جس نے ہمارے امر (دین) میں وہ چیز نکالی جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے۔“ (صحیح بخاری: ۲۵۰۰، صحیح مسلم: ۱۷۸۸)، جن (عقائد) کے بارے میں مسلمانوں نے اختلاف کیا ہے (یعنی وہ مشابہات میں سے ہیں) اور ان کی اصل کتاب و سنت میں موجود ہے، ان پر ایمان واجب ہے اور اس کی تاویل کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیا جائے گا، اور اس کے بارے میں وہی کہا جائے گا، جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا يَعْزِمُ أَنَّ إِلَهَ اللَّهِ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران: ۷) (اس کی تاویل سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور علم میں رسوخ رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے)، ہم کسی (مشابہ) چیز کی تاویل میں نہیں پڑتے اور یہ وہ مسائل اجتہاد یا اور فروع و جزیہ ہیں جن مسلمانوں کا اختلاف ہو گیا ہے تو ان کی وجہ سے انسان بدعتی نہیں ہوتا، نہ ہی اس پر مذمت و وعید کی جائے گی۔“ (الحجۃ فی بیان المحبتۃ: ۴۱۱-۴۱۲)

مانعین رفع الیدین کے دلائل کا علمی محاسبہ

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین متواتر احادیث سے ثابت ہے۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۴۸ھ) نے رفع الیدین کو ”سنت متواترہ“ قرار دیا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۹۳/۵)

علامہ زرکشی (۷۴۵-۷۹۲ھ) لکھتے ہیں: **وفی دعویٰ أنّ أحادیث الرفع فیما عدا**

التحریم لم تبلغ مبلغ التواتر نظر، وکلام البخاری فی کتاب رفع الیدین مصرّح ببلوغها ذلک .

”یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع الیدین کی احادیث تواتر تک نہیں پہنچیں، کتاب

(جز) رفع الیدین میں امام بخاری کی کلام ان کے تواتر تک پہنچنے کی صراحت کرتی ہے۔“

(المعتبر فی تخریج احادیث المنہاج والمختصر للزرکشی :

(۱۳۶

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **وفی دعویٰ ابن کثیر أنّ حدیث رفع الیدین فی أوّل**

الصلاة دون حدیث رفع الیدین عند الركوع متواتر نظر، فإنّ کلّ من روی الأوّل روی الثاني الآ

اليسیر ... ”حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ نماز کے شروع میں رفع الیدین متواتر

ہے، رکوع کے وقت متواتر نہیں، بلاشبہ سوائے ایک دوراویوں کے ہر وہ راوی جس نے پہلی رفع الیدین بیان

کی ہے، اس نے دوسری رفع الیدین بھی بیان کی ہے۔“ (موافقة الخبر الخبر لابن حجر: ۴۹۷)

مانعین رفع الیدین کے پاس کوئی مرفوع، صحیح اور خاص دلیل نہیں، ان کے عمومی دلائل کا مختصر اور جامع

علمی و تحقیقی جائزہ پیش خدمت ہے:

دلیل نمبر ①: سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان

کرتے ہیں: **أنه كان يرفع يديه في أوّل تكبيرة، ثم لا يعود .**

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی تکبیر میں رفع الیدین فرماتے تھے، پھر دوبارہ نہ کرتے۔“

(مسند الامام احمد: ۳۸۸/۱، سنن ابی داؤد: ۷۴۸، سنن الترمذی: ۱۰۲۷، سنن الترمذی: ۲۵۷)

تبصرہ: ① یہ روایت ”ضعیف“ ہے، اس میں امام سفیان ثوری ہیں، جو کہ بالاجماع

”مَدْلَس“ ہیں، ساری کی ساری سندوں میں ”عن“ سے روایت کر رہے ہیں، سماع کی تصریح ثابت نہیں۔
مسلم اصول ہے کہ جب ”ثقة مدلس“ بخاری و مسلم کے علاوہ ”عن“ یا ”قال“ کے الفاظ کے ساتھ
حدیث بیان کرے تو وہ ”ضعیف“ ہوتی ہے۔

اس حدیث کے راوی امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) نے امام ہشیم بن بشیر رحمہ اللہ (م ۱۸۳ھ)
سے پوچھا، آپ ”تدلیس“ کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اَنَّ كِبْرِيكَ قَدْ دَلَّسَا،
الأعمش وسفيان . ”آپ کے دو بڑوں امام اعمش اور امام سفيان رحمہما اللہ نے بھی تدلیس کی ہے۔“
(الكامل لابن عدی : ۹۵/۷، ۱۳۵/۷ وسندہ صحیح)

امام عینی حنفی لکھتے ہیں: سفيان من المدلسين ، والمدلس لا يحتج بعننته إلا أن يثبت
سماعه من طريق آخر . ”سفيان مدلس راویوں میں سے ہیں اور مدلس راوی کے عنعنہ سے حجت
نہیں لی جاتی، الا یہ کہ دوسری سند میں اس کا سماع ثابت ہو جائے۔“ (عمدة القاری : ۱۱۲/۳)

② یہ ”ضعیف“ روایت عام ہے، جبکہ رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع
الیدین کے متعلق احادیث خاص ہیں، خاص کو عام پر مقدم کیا جاتا ہے، لہذا یہ حدیث عدم رفع الیدین کے
ثبوت پر دلیل نہیں بن سکتی۔

③ مانعین رفع الیدین یہ بتائیں کہ وہ اس حدیث کو پس پشت ڈالتے ہوئے خود تروں اور
عیدین میں پہلی تکبیر کے علاوہ کیوں رفع الیدین کرتے ہیں؟

حدیث ابن مسعود رحمہ اللہ محدثین کرام کی نظر میں

① امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لم يثبت عندی حدیث ابن مسعود .
”میرے نزدیک حدیث ابن مسعود ثابت نہیں۔“ (سنن الترمذی : تحت حدیث ۲۵۶، سنن الدارقطنی : ۳۹۳/۱،
السنن الکبریٰ للبیہقی : ۷۹/۲، وسندہ صحیح)

② امام ابوداؤد رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
ولیس ہو بصحیح علی هذا اللفظ . ”یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ صحیح نہیں۔“

③ امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: هذا خطأ . ”یہ غلطی ہے۔“ (العلل : ۹۶/۱)

④ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ولیس قول من قال : ثم لم يعد محفوظاً .

”جس راوی نے دوبارہ رفع الیدین نہ کرنے کے الفاظ کہے ہیں، اس کی روایت محفوظ نہیں۔“ (العلل: ۱۷۳/۵)

⑤ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”هو في الحقيقة أضعف شيء يعول عليه، لأن له عدلاً تبطله.“ ”درحقیقت یہ ضعیف ترین چیز ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں کئی علتیں ہیں جو اسے باطل قرار دیتی ہیں۔“ (التلخیص الحبیبر لابن حجر: ۲۲۲/۱)

تنبیہ: اگر کوئی کہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”حسن“ کہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حنفی مذہب کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے:

”ابن دحیہ نے اپنی کتاب ”العلم المشہور“ میں کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں کتنی ہی موضوع (من گھڑت) اور ”ضعیف“ سندوں والی احادیث کو ”حسن“ کہہ دیا ہے۔“ (نصب الرایۃ للزیلعی: ۲/۲۱۷، البیانۃ للعینی: ۸۶۹/۲، مقالات الکوثری: ۳۱، صفائح اللجین از احمد رضا خان بریلوی: ۲۹)

اہل علم جانتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا تساہل معروف ہے، وہ کتنی ”ضعیف“ احادیث کو ”حسن“ کہہ دیتے ہیں، خود حنفی بھائی جرابوں کے مسح والی حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ کے ”حسن“ کے ساتھ ساتھ ”صحیح“ کہنے کے باوجود بھی ”حسن“ تسلیم نہیں کرتے۔

دلیل نمبر ④: سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں:

خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: مالي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس؟ اسكنوا في الصلاة! ”رسول کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا، مجھے کیا ہے کہ میں تمہیں شریگھوڑوں کی دموں کی طرح ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھ رہا ہوں، نماز میں سکون کیا کرو!“ (صحیح مسلم: ۱۸۱/۱، ح: ۴۳۰)

تبصرہ: ① اس ”صحیح“ حدیث میں رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین

کی نفی نہیں ہے، بلکہ محدثین کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس کا تعلق تشہد اور سلام کے ساتھ ہے، نہ کہ قیام کے ساتھ، تمیم بن طرفہ کی یہی روایت اختصار کے ساتھ مسند الامام احمد (۹۳/۵) میں موجود ہے، جس میں وہم قعود (آپ ﷺ نے یفرمان اس حال میں جاری فرمایا کہ صحابہ کرام تشہد میں بیٹھے ہوئے تھے) کے الفاظ ہیں، اس کی وضاحت و تائید دوسری روایت میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

كُنَّا إِذَا صَلَّيْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ،

السَّلام عليكم ورحمة الله ، وأشار بيده الى الجانبين ، فقال رسول الله صَلَّى الله عليه وسلَّم :
 علام تؤمون بأيديكم كأنها أذنان خيل شمس ؟ أنما يكفى أحدكم أن يضع يده على فخذهِ ، ثم
 يسَلِّم على أخيه من على يمينه وشماله . ”هم جب رسول کریم ﷺ کے ساتھ (بجماعت) نماز
 پڑھتے تھے تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے، انہوں نے اپنے ہاتھ کے ساتھ دونوں جانب
 اشارہ کیا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم اپنے ہاتھوں کے ساتھ یوں اشارہ کیوں کرتے ہو، جیسے وہ شریروں
 گھوڑوں کی دیں ہوں؟ تم میں سے کسی کو یہ کافی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کو اپنی ران پر رکھے، پھر اپنے بھائی (ساتھ
 نماز پڑھنے والے) پر دائیں اور بائیں سلام کہے۔“ (صحیح مسلم: ۱۸۷۱، ح: ۴۳۱)

اس روایت نے بھی اوپر والی روایت کا مطلب واضح کر دیا ہے، اس پر مستزاد محدثین کا فہم سونے پر
 سہاگہ ہے، لہذا اس حدیث سے رفع الیدین کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرنا اہل حق کو زیبا نہیں، کسی محدث نے
 اس حدیث کو عدم رفع الیدین کے لیے پیش نہیں کیا، ایک مؤمن کا ایمان اس بات کو کیسے تسلیم کر لے کہ جو کام
 نبی کریم ﷺ پہلے خود کرتے تھے، وہی کام اپنے صحابہ کو کرتے دیکھا تو اس کو سرکش گھوڑوں کی دُموں کی حرکت
 سے تشبیہ دے دی؟

اس حدیث کے بارے میں دیوبندیوں کے ”شیخ الہند“، محمود الحسن دیوبندی صاحب کہتے ہیں:
 ”باقی اذنان خیل کی روایت سے جواب دینا از روئے انصاف درست نہیں، کیونکہ وہ سلام کے
 بارے میں ہے۔“ (تقاریر شیخ الہند: ۶۵، مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

اس حدیث کے بارے میں جناب محمد تقی عثمانی حیاتی دیوبندی کہتے ہیں: ”لیکن انصاف کی بات
 یہ ہے کہ اس حدیث سے حنفیہ کا استدلال مشتبہ اور کمزور ہے، کیونکہ ابن القبطیہ کی روایت میں سلام کے وقت
 کی جو تصریح موجود ہے، اس کی موجودگی میں ظاہر اور متبادر یہی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث رفع عند
 السلام سے متعلق ہے اور دونوں حدیثوں کو الگ الگ قرار دینا جب کہ دونوں کا راوی بھی ایک ہے اور متن بھی
 قریب قریب ہے، بعد سے خالی نہیں، حقیقت یہی ہے کہ حدیث ایک ہی ہے اور رفع عند السلام سے متعلق
 ہے، ابن القبطیہ کا طریق مفصل ہے اور دوسرا طریق مختصر و مجمل، لہذا دوسرے طریق کو پہلے طریق پر ہی محمول
 کرنا چاہیے، شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت (انور) شاہ صاحب (کشمیری) نور اللہ مرقدہ اس حدیث کو حنفیہ
 کے دلائل میں ذکر نہیں کیا۔“ (درس ترمذی از تقی: ۳۷/۲)

مشہور حنفی امام، ابن ابی العزیز رحمہ اللہ (۷۹۲ھ) اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں: وما استدلل به من حديث جابر بن سمرة رضى الله عنه قال: خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: ما لي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذنان خيل شمس؟ اسكنوا في الصلاة! رواه مسلم، وأن الأمر بالسكون في الصلاة ينافي الرفع عند الركوع والرفع منه لا يقوى، لأنه قد جاء في رواية أخرى لمسلم عنه، قال: صلينا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فكنا إذا سلمنا، قلنا بأيدينا: السلام عليكم، فنظر إلينا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: ما لكم تشيرون بأيديكم كأنها أذنان خيل شمس، إذا سلم أحدكم فليلتفت إلى صاحبه، ولا يؤمى بيده.

وأيضا فلا نسلم أن الأمر بالسكون في الصلاة ينافي الرفع عند الركوع والرفع منه، لأن الأمر بالسكون ليس المراد منه ترك الحركة في الصلاة مطلقا، بل الحركة المنافية للصلاة بدليل شرع الحركة للركوع والسجود ورفع اليدين عند تكبيرة الافتتاح وتكبير القنوت وتكبيرات العيدين، فان قيل: خرج ذلك بدليل، قيل: وكذلك خرج الرفع عند الركوع والرفع منه بدليل، فعلم أن المراد منه الإشارة بالسلام باليد.

”اور جو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی صحیح مسلم والی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سرکش گھوڑوں کی دُموں کی طرح ہاتھ اٹھانے سے منع فرمایا اور نماز میں سکون کا حکم فرمایا، نیز یہ کہنا کہ نماز میں سکون کا حکم رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کے منافی ہے، کوئی قوی بات نہیں، کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ سے ہی مروی صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے، ہم (صحابہ) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (باجماعت) نماز پڑھتے تھے، جب ہم سلام پھیرتے تو اپنے ہاتھوں کے ساتھ (اشارہ کر کے) السلام علیکم کہتے، رسول کریم ﷺ نے ہماری طرف دیکھا تو فرمایا، تمہیں کیا ہے کہ تم اپنے ہاتھوں کے ساتھ ایسے اشارہ کرتے ہو، جیسے وہ شریگھوڑوں کی دُمیں ہوں، جب تم میں سے کوئی سلام پھیرے تو اپنے (ساتھ والے) بھائی کی طرف منہ پھیرے، ہاتھ کے ساتھ اشارہ نہ کرے۔

اسی طرح ہم اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ نماز میں سکون کا حکم رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کی نفی کرتا ہے، کیونکہ سکون کے حکم سے مراد یہ نہیں کہ نماز میں بالکل حرکت ختم چھوڑ دی جائے، بلکہ اس حرکت کی نفی ہے جو نماز کے منافی ہے، دلیل یہ ہے کہ رکوع، سجدہ، تکبیر تحریمہ، قنوت کی تکبیر اور عیدین کی تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین مشروع ہے (وہ بھی تو حرکت ہے)۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حرکت دلیل کے ساتھ (ممانعت سے) خارج ہوگئی ہے، تو اسے بھی یہی جواب دیا جائے گا کہ رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت کی رفع الیدین بھی دلیل کے ساتھ (ممانعت سے) خارج ہوگئی ہے۔

معلوم ہوا کہ اس (صحیح مسلم کی حدیث جابر رضی اللہ عنہ) سے مراد سلام کے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنا ہے۔“

(التنبیہ علی مشکلات الهدایة لابن ابی العز الحنفی: ۵۷۰/۲-۵۷۱)

اتنی وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنت رفع الیدین کے خلاف یہ حدیث پیش کرے تو اس پر افسوس ہے کہ وہ جہالت پر مبنی اس طرح کی بعید و عجیب باتیں کرتا ہے!

حافظ ابن الملقن رحمۃ اللہ علیہ (۷۲۳-۸۰۴ھ) اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: وهو حدیث جابر بن سمرة، فجعله معارضا لما قدّمناه من أقبح الجهالات لسنة سيدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم، لأنه لم يرد في رفع الأيدي في الركوع والرفع منه، وإنما كانوا يرفعون أيديهم في حالة السلام من الصلاة ويشيرون بها إلى الجانبين، يريدون بذلك السلام على من على الجانبين، وهذا لا اختلاف فيه بين أهل الحديث، ومن له أدنى اختلاط بأهله، وبرهان ذلك أن مسلم بن الحجاج رواه في صحيحه من طريقين... ”وہ جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ کی حدیث

ہے، اسے ہماری پیش کردہ روایات (رفع الیدین) کے مخالف بنانا ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فتنج ترین جہالت ہے، کیونکہ یہ حدیث رکوع جانے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بارے میں نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرام نماز سے سلام پھیرنے کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر دونوں طرف اشارہ کرتے تھے، وہ اس سے سلام کرنے کا ارادہ کرتے تھے، اس بارے میں محدثین اور ان سے ادنیٰ سا بھی تعلق رکھنے والوں میں کوئی اختلاف نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ امام مسلم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں دوسندوں کے ساتھ

روایت کیا ہے۔۔۔۔۔“ (البدر المنیر لابن الملقن: ۴/۴۸۵)

شرح مسلم حافظ نووی رحمۃ اللہ علیہ (۶۷۲ھ) لکھتے ہیں: وأما حدیث جابر بن سمرة، فاحتجاجهم به من أعجب الأشياء، وأقبح أنواع الجهالة بالسنة، لأن الحديث لم يرد في رفع الأيدي في الركوع والرفع منه، ولكنهم كانوا يرفعون أيديهم في حالة السلام من الصلاة ويشيرون بها إلى الجانبين، يريدون بذلك السلام على من عن الجانبين، وهذا لا خلاف فيه بين أهل الحديث ومن له أدنى اختلاط بأهل الحديث، وبيّنه أن مسلم بن الحجاج رحمه الله

رواہ فی صحیحہ من طریقین ...

”رہی سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث تو ان (احناف) کا اس سے دلیل لینا بہت بڑا عجوبہ اور سنتِ رسول سے جہالت کا قبیح ترین نمونہ ہے، کیونکہ یہ حدیث رکوع جاتے اور سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کے بارے میں نہیں، بلکہ صحابہ کرام نماز سے سلام پھیرنے کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے اور ان کے ساتھ دونوں جانب اشارہ کرتے تھے، ان کا ارادہ دونوں جانب سلام کرنے کا ہوتا تھا، اس بات میں محدثین اور ان سے ادنیٰ سا تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں، اس کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ امام مسلم بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں دو سندوں سے روایت کیا ہے۔۔۔“ (المجموع: ۴۰۳/۳)

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۵۴ھ) نے اس حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے: ذکر الخبر المقتضى للفظه المختصرة التي تقدم ذكرنا لها ، بأن القوم إنما أمروا بالسكون في الصلاة عند الإشارة بالتسليم دون رفع اليدين عند الركوع . ”اس حدیث کا بیان جو تقاضا کرتی ہے کہ ہمارے پہلے ذکر کردہ مختصر الفاظ سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام کو صرف نماز میں سلام کا اشارہ کرتے وقت سکون کا حکم دیا گیا تھا، نہ کہ رکوع میں رفع الیدین کرتے وقت۔“ (صحیح ابن حبان: تحت حدیث ۱۸۸۰)

امیر المؤمنین فی الحدیث، فقیہ الامت، سیدنا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۵۶ھ) اس حدیث جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں: فأنما كان هذا في التشهد ، لا في القيام ، كان يسلم بعضهم على بعض ، فنهى النبي صلى الله عليه وسلم عن رفع الأيدي في التشهد ، ولا يحتج بهذا من له حظ من العلم ، هذا معروف مشهور ، لا اختلاف فيه ، ولو كان كما ذهب اليه لكان رفع الأيدي في أول التكبيرة وأيضا تكبيرات صلاة العيدين منهيًا عنها ، لأنه لم يستثن رفعاً دون رفع ، وقد بينه حديث ... ”یہ حدیث تشہد کے بارے میں تھی، نہ کہ قیام کے بارے میں، صحابہ کرام (ہاتھ اٹھا کر) ایک دوسرے پر سلام کہتے تھے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد میں ہاتھوں کو اٹھانے سے منع فرمادیا، اس حدیث سے کوئی بھی ایسا شخص (رفع الیدین کی ممانعت پر) دلیل نہیں لے گا جس کو علم کا کچھ حصہ نصیب ہوا ہو، یہ بات مشہور و معروف ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اگر بات ایسے ہوتی، جیسے یہ (مانع رفع الیدین) گیا ہے تو پہلی تکبیر اور عید کی تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین بھی منع ہونا چاہیے تھا، کیونکہ (اس حدیث میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین کا کوئی موقع متعین نہیں فرمایا، پھر (دوسری) حدیث نے بھی اس کی وضاحت کر دی

ہے۔“ (جزء رفع الیدین للامام البخاری: ص ۶۱-۶۲)

② اگر رفع الیدین نماز میں سکون کے منافی ہے تو شروع نماز میں، نیز وتروں اور عیدین کا رفع الیدین کیوں کیا جاتا ہے؟ شروع نماز میں رفع الیدین نماز میں داخل ہے، جیسا کہ سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: کان اذا کبر رفع یدیه . ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ اکبر کہتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔“ (صحیح مسلم: ۱۶۸۸، ح: ۳۹۱) یہ بات تو مسلم ہے کہ نماز تکبیر تحریمہ سے شروع ہو جاتی ہے۔

الحاصل: حدیث جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق بلا اختلاف سلام کے ساتھ ہے، اس سے عدم رفع الیدین پر دلیل لینے والا امام بخاری، حافظ نووی اور حافظ ابن الملقن رحمہم اللہ کے نزدیک ”جاہل“ اور محمود الحسن دیوبندی و تقی عثمانی دیوبندی صاحبان کے نزدیک ”ناانصاف“ ہے۔

دلیل نمبر ③: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، اذا افتتح رفع یدیه حتی یحاذی بها منکبیه واذا أراد أن یرکع وبعد ما یرفع رأسه لا یرفعهما . ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اپنے کندھوں کے برابر رفع الیدین کرتے۔۔۔ اور جب رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔“ (صحیح ابی عوانہ: ۹۰/۲)

تبصرہ: ① اس حدیث کو عدم رفع الیدین کے ثبوت میں وہی پیش کر سکتا ہے جو شرم و حیا سے عاری اور علمی بددیانتی کا مرتکب ہو، کسی محدث نے اس حدیث کو رفع الیدین نہ کرنے پر پیش نہیں کیا۔ دراصل لا یرفعهما والے الفاظ کا تعلق اگلے الفاظ بین السجدتین کے ساتھ تھا، اصل میں یوں تھا: ولا یرفعهما بین السجدتین. ”اور آپ دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔“ بعض الناس نے ان الفاظ کے شروع سے ”واو“ گرا کر اس کا تعلق پچھلی عبارت سے جوڑنے کی جسارت کی ہے، جبکہ یہ ”واو“ مسند ابی عوانہ کے دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔

② اس روایت کے راوی امام سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ سے یہی روایت ان کے چھ ثقہ شاگرد ولا یرفعهما بین السجدتین (آپ دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے) کے الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم: ۱۶۸۸، ح: ۳۹۰)

③ امام ابو عوانہ رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ بعض راویوں نے ولا یرفع بین السجدين کے الفاظ روایت کیے ہیں، جبکہ معنی ایک ہی ہے، یعنی آپ دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔

④ امام ابو عوانہ رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے: بیان رفع الیدین فی افتتاح الصّلاة قبل التّکبیر بحذاء منکبیه وللرّکوع ولرفع رأسه من الرّکوع ، وانه لا یرفع بین السّجدين . ”نماز کے شروع میں تکبیر سے پہلے، رکوع کے لیے اور رکوع سے سر اٹھانے کے لیے رفع الیدین کا بیان اور اس بات کا بیان کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔“ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک محدث رفع الیدین کے ثبوت کا باب قائم کرے اور حدیث وہ لائے جس سے رفع الیدین کی نفی ہو رہی ہو، یہ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی سنا اپنی دکان پر گوشت اور سبزی کا بورڈ سجا دے۔

⑤ خود امام ابو عوانہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی اور امام ابو داؤد رحمہما اللہ کی روایات جن میں رکوع کو جاتے اور سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کا ثبوت ہے، اسی روایت کی طرح ہیں، لہذا یہ حدیث رفع الیدین کے ثبوت پر چوٹی کی دلیل ہے۔ والحمد للہ !

دلیل نمبر ④ : سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا افتتح الصّلاة رفع یدیه حذو منکبیه واذا اراد أن یرکع وبعد ما یرفع رأسه من الرّکوع فلا یرفع ولا بین السّجدين . ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے تو کندھوں کے برابر رفع الیدین کرتے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین نہیں کرتے تھے، نہ ہی سجدوں کے درمیان کرتے تھے۔“ (مسند الحمیدی: ۲/۲۷۷، ح: ۶۱۴)

تبصرہ : اس حدیث سے عدم رفع الیدین پر دلیل لینا دیانت علمی کے خلاف ہے، کیونکہ مسند الحمیدی کے جس نسخہ سے یہ روایت ذکر کی گئی ہے، وہ جعلی نسخہ ہے، جو حبیب الرحمن اعظمی دیوبندی صاحب کی تحقیق سے ساتھ چھپا ہے۔

ہم حیران ہیں کہ ایک بڑا نفیس واعلیٰ اور معتمد علیہا نسخہ ظاہر یہ ۶۰۳ھ، جس کے نسخہ محدث احمد بن عبد الخالق ہیں، دوسرا نسخہ ظاہر یہ ۶۸۹ھ، جس کے نسخہ احمد بن نصر الدقوی ہیں، ان دونوں قدیم نسخوں کو چھوڑ کر ایک ایسے نسخہ مخرف پر اعتماد کر لیا گیا ہے، جس کا کوئی صفحہ غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔

مسند الحمیدی والی یہی حدیث ابن عمر المسند المستخرج علی صحیح الامام مسلم لأبی نعیم الاصبہانی (۱۷/۲) پر ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے: عن عبد اللہ بن عمر: رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اذا افتتح الصلاة رفع يديه حذو منكبيه واذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع، ولا يرفع بين السجدين، اللفظ للحمیدی.

یعنی امام ابو نعیم رحمہ اللہ نے یہ روایت امام حمیدی کے الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے، لیکن اس میں رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کا اثبات ہے، یہ روایت حبیب الرحمن اعظمی صاحب کے رد میں بڑی زبردست دلیل ہے، کسی محدث یا کسی حنفی امام نے ان دیوبندیوں سے پہلے اس روایت کو عدم رفع الیدین کے لیے پیش نہیں کیا، کیوں؟ جبکہ مسند الحمیدی ہر دور میں متداول رہی ہے۔

معلوم ہوا کہ مسند الحمیدی والی حدیث عدم کے بجائے اثبات رفع الیدین کی زبردست دلیل ہے۔

دلیل نمبر ۵: سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ان رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا افتتح الصلاة رفع يديه الى قريب من اذنيه، ثم لا يعود.

”بے شک رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اپنے کانوں کے قریب تک رفع الیدین کرتے، پھر دوبارہ نہ فرماتے۔“ (سنن ابی داؤد: ۷۴۹، سنن الدارقطنی: ۲۹۳/۸، مسند ابی یعلیٰ: ۱۶۹۰)

تبصرہ: ① اس کی سند ”ضعیف“ ہے، حافظ محدثین کا اس حدیث کے ”ضعف“ پر

اجماع و اتفاق ہے، اس کا راوی یزید بن ابی زیاد جمہور کے نزدیک ”ضعیف“ اور ”سبی الحفظ“ ہے، نیز یہ ”مُلس“ اور ”مُخلط“ بھی ہے، تلقین بھی قبول کرتا تھا، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ضعیف، کبر، فتغیر و صار يتلقن و كان شيعيًا.

قبول کرنے لگا تھا، یہ شیعہ بھی تھا۔“ (تقریب التہذیب: ۷۷۷)

نیز لکھتے ہیں: والجمہور علیٰ تضعیف حدیثہ.

”جمہور محدثین اس کی حدیث کو ضعیف کہتے ہیں۔“ (ہدی الساری: ۴۵۹)

بوصری لکھتے ہیں: یزید بن ابی زیاد أخرج له مسلم في المتابعات وضعفه الجمهور.

”یزید بن ابی زیاد کی حدیث امام مسلم رحمہ اللہ نے متابعات میں بیان کی ہے، جمہور نے اسے ضعیف قرار

دیا ہے۔“ (زوائد ابن ماجہ: ۵۴۹/۲)

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لا یخرج منه فی الصحیح ، ضعیف ، یخطئ کثیرا .
 ”کسی صحیح کتاب میں اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کی جائے گی، یہ ضعیف ہے اور بہت زیادہ غلطیاں کرتا

تھا۔“ (سوالات البرقانی: ۵۶۱)

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ولیس هو بالمتقن ، فلذا لم یحتج بہ الشیخان .
 ”وہ پختہ راوی نہیں، اسی لیے شیخین (بخاری و مسلم) نے اس سے حجت نہیں لی۔“ (میر اعلام النبلاء: ۱۲۹/۶)
 یہ صحیح مسلم کا راوی نہیں ہے، امام مسلم نے اس سے مقروناً روایت لی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ولم یکن یزید بن أبی زیاد بالحافظ ، لیس بذاک .
 ”یزید بن ابی زیاد حافظ نہیں تھا، حدیث کی روایت کے قابل نہ تھا۔“ (الجرح والتعديل: ۲۶۵/۹)

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لیس بالقوی . ”یہ قوی نہیں تھا۔“ (الجرح والتعديل: ۲۶۵/۹)
 امام ابو زرعة الرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لین ، یکتب حدیثہ ، ولا یحتج بہ . ”کمزور راوی ہے، اس کی حدیث لکھی جائے گی، لیکن اس سے حجت نہیں لی جائے گی۔“ (الجرح والتعديل: ۲۶۵/۹)
 امام جوزجانی کہتے ہیں: سمعتهم یضعفون حدیثہ . ”میں نے محدثین کو اس کی حدیث کو ضعیف قرار دیتے سنا ہے۔“ (احوال الرجال: ۱۳۵)

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لیس بالقوی . ”یہ قوی نہیں۔“ (الضعفاء والمتروکون: ۶۵۱)
 امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ولا یحتج بحدیث یزید بن أبی زیاد . ”یزید بن ابی زیاد کی حدیث سے حجت نہیں لی جائے گی۔“ (تاریخ یحییٰ بن معین: ۳۶۴)
 امام کعب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لیس بشئ . ”یہ (حدیث میں) کچھ بھی نہیں۔“

(الضعفاء للعقيلي: ۳۸۰/۴، وسندہ صحیح)

امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (الضعفاء للعقيلي: ۴۸۰/۴، وسندہ صحیح)
 امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کان یزید بن ابی زیاد رقاعاً . ”یزید بن ابی زیاد رقاع (موقوف روایات کو مرفوع بنا دینے والا) تھا۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۲۶۵/۹)

امام عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ارم بہ . ”اسے پھینک (چھوڑ دو)۔“ (تہذیب التہذیب: ۲۸۸/۱)
 امام ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ویزید من شیعة أهل الكوفة ، مع ضعفه یکتب حدیثہ .

”یزید اہل کوفہ کے شیعہ میں سے ہے، ضعف کے ساتھ ساتھ اس کی حدیث لکھی جائے گی۔“ (الکامل: ۳۷۶/۷)

لہذا امام عجل (تاریخ العجلی: ۲۰۱۹) اور امام ابن سعد (الطبقات الکبریٰ: ۳۴۰/۶) کا اس کو ”ثقة“ کہنا اور امام ابن شاہین کا اسے ”الثقات (۱۵۱۱)“ میں ذکر کرنا جمہور کی تضعیف کے مقابلے میں ناقابل التفات ہے۔

نیز اس کی توثیق کے بارے میں احمد بن صالح المصری کا قول ثابت نہیں ہے۔

الحاصل: یہ حدیث باقیا محدثین ”ضعیف“ ہے، ”ضعف“ کے ساتھ ساتھ یزید بن ابی زیاد نے اسے بیان بھی اختلاط کے بعد کیا ہے۔

② یہ روایت ”ضعیف“ ہونے کے ساتھ ساتھ عام بھی ہے، جبکہ رکوع والے رفع الیدین کی دلیل خاص ہے، لہذا خاص کو عام پر مقدم کیا جائے گا۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: هذا خبر عول عليه أهل العراق في نفي رفع الیدین في الصلاة عند الركوع وعند رفع الرأس منه ، وليس في الخبر : ثم لم يعد ، وهذه الزيادة لقنها أهل الكوفة يزيد بن أبي زياد في آخر عمره ، فتلقن ، كما قال سفيان بن عيينة : أنه سمعه قديما بمكة يحدث بهذا الحديث باسقاط هذه اللفظة ، ومن لم يكن العلم صناعته لا يذكر له الاحتجاج بما يشبه هذا من الأخبار الواهية .

”یہ وہ حدیث ہے جس پر اہل عراق نے نماز میں رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کی نفی میں اعتماد کیا ہے، حالانکہ حدیث میں ثم لم يعد (پھر دوبارہ نہ کیا) کے الفاظ نہیں تھے، یہ زیادت یزید بن ابی زیاد کو اس کی آخری عمر میں اہل کوفہ نے تلقین کی تھی، اس نے اسے قبول کر لیا، جیسا کہ امام سفيان بن عيينہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے پہلے دور میں مکہ میں اسے یہی حدیث بیان کرتے ہوئے سنا تھا، اس وقت انہوں نے یہ الفاظ بیان نہیں کیے تھے، جو آدمی فن حدیث کا اہل نہ ہو، اس کے لیے اس طرح کی ضعیف روایات کو بطور دلیل ذکر کرنا درست نہیں ہے۔“ (المجروحین لابن حبان: ۱۰۰/۳)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ذکر ترک العود الى الرفع ليس بثابت عن النبي صلى الله عليه وسلم ، فكان يزيد بن أبي زياد يروي هذا الحديث قديما ولا يذكره ، ثم تغير وساء حفظه ، فلقنه الكوفيون ذلك ، فتلقنه ووصله بمتن الحديث .

”(تکبیر تحریر میں رفع الیدین کے بعد) دوبارہ رفع الیدین کو چھوڑنا نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں، یزید

بن ابی زیاد اس حدیث کو پہلے پہل بیان کرتا تھا، لیکن ان الفاظ کو ذکر نہیں کرتا تھا، پھر اس کا حافظ خراب ہو گیا تو کو فیوں نے اس کو ان الفاظ کی تلقین کی، اس نے قبول کر لی اور اسے متن کے ساتھ ملا دیا۔“ (المدرج: ۳۶۹)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: واتفق الحفاظ على أن قوله: ثم لم يعد، مدرج في الخبر من قول يزيد بن أبي زياد.... ”حفاظ محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ثم لم يعد کے الفاظ اس حدیث میں مدرج ہیں، یہ یزید بن ابی زیاد کی اپنی بات ہے۔“ (التلخیص الحبیہ: ۲۲۷)

دلیل نمبر ۶: سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم رفع يديه حين افتتح الصلاة، ثم لم يرفعهما حتى انصرف. ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ نے جب نماز شروع کی تو رفع الیدین کیا، پھر سلام پھیرنے تک دوبارہ نہیں کیا۔“ (سنن ابی داؤد: ۷۵۲، مسند ابی یعلیٰ: ۱۶۸۹، شرح معانی الآثار: ۲۲۴/۱)

تبصرہ: اس کی سند ”ضعیف“ ہے، اس کا راوی ابن ابی لیلیٰ جمہور کے نزدیک ”ضعیف“ ہے، اس حدیث کے تحت امام ابوداؤد فرماتے ہیں: هذا الحديث ليس بصحيح. ”یہ حدیث صحیح نہیں۔“ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن أبي ليلى كان سيء الحفظ. ”ابن ابی لیلیٰ خراب حافظہ والا تھا۔“ (العلل: ۱۴۳۸)

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ومحمد بن عبد الرحمن بن أبي ليلى لا يحتج بحديثه، وهو أسوأ حالا عند أهل المعرفة بالحديث من يزيد بن أبي زياد. ”محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کی حدیث سے حجت نہیں لی جائے گی، اس کی حالت محدثین کے نزدیک یزید بن ابی زیاد سے بھی بری تھی۔“ (معرفة السنن والآثار للبيهقي: ۴۹۹/۲)

دلیل نمبر ۷: سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا افتتح الصلاة رفع يديه حتى يحاذي منكبيه، لا يعود يرفعهما حتى يسلم من صلاته. ”رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو کندھوں کے برابر رفع الیدین کیا، دوبارہ آپ رفع الیدین نہیں کرتے تھے، حتیٰ کی نماز سے سلام پھیر دیتے۔“ (مسند ابی حنیفہ لابی نعیم: ص ۱۵۶)

تبصرہ: یہ سند سخت ترین ”ضعیف“ ہے، اس میں ابو حنیفہ نعمان بن ثابت باجماع محدثین ”ضعیف“ ہیں

ان کے حق میں کسی ”ثقة“ امام سے باسند ”صحیح“ کوئی ادنیٰ کلمہ توثیق بھی ثابت نہیں، مدعی پر دلیل لازم ہے۔

دلیل نمبر ۸: سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ أَبِي بَكْرٍ وَمَعَ عُمَرَ ، فَلَمْ يَرَفَعُوا أَيْدِيَهُمْ إِلَّا عِنْدَ التَّكْبِيرَةِ الْأُولَى فِي افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ . ”میں نے نبی کریم ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی، انہوں نے صرف نماز کے شروع میں پہلی تکبیر کے وقت رفع الیدین کیا۔“ (سنن الدارقطنی: ۲۹۵/۸، ح: ۱۱۲۰ واللفظ لہ: مسند ابی یعلیٰ: ۵۰۳۹)

تبصرہ: یہ روایت سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ ① اس کا راوی محمد بن جابر یمامی

جہور محدثین کے نزدیک ”ضعیف“ ہے، حافظ یثیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهو ضعيف عند الجمهور .

”یہ جہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔“ (مجمع الزوائد: ۳۴۶/۵)

اس کو امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام یحییٰ بن معین، امام عمرو بن علی الفلاس، امام نسائی، امام جوزجانی، امام دارقطنی وغیرہم رحمہم نے مجروح و ”ضعیف“ کہا ہے۔

امام دارقطنی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: تفرّد به محمد بن جابر الیمامی و کان

ضعيفا . ”اس کو بیان کرنے میں محمد بن جابر یمامی راوی متفرّد ہے اور وہ ضعیف تھا۔“ (سنن الدارقطنی: ۲۹۵/۸)

امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: هذا ابن جابر ايش حديثه ؟ هذا حديث

منكر ، أنكره جدًا . ”یہ محمد بن جابر ہے، اس کی حدیث کیا ہے؟ یہ ایک منکر حدیث ہے، میں اسے سخت

منکر سمجھتا ہوں۔“ (العلل: ۱۴۴/۸)

امام عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لا يتابع محمد بن جابر على هذا الحديث ولا على عامة

حديثه . ”محمد بن جابر کی نہ اس حدیث میں متابعت کی گئی ہے اور نہ ہی عام احادیث پر۔“ (الضعفاء: ۴۲/۴)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ”ضعیف“ کہا ہے۔ (معرفۃ السنن والآثار للبيهقي: ۴۲۴/۲)

حافظ ابن الجوزی فرماتے ہیں: هذا حديث لا يصح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم .

”یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔“ (الموضوعات: ۹۶/۲)

امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وحديثه عن حمّاد ، فيه اضطراب . ”اس کی

حدیث حماد بن ابی سلیمان سے مضطرب ہوتی ہے۔“ (الجرح والتعديل: ۲۱۹/۷)

یہ روایت بھی اس نے اپنے استاذ حماد سے بیان کی ہے، لہذا یہ جرح مفسر ہے۔

تنبیہ: محمد بن جابر یمامی کہتے ہیں: سرق أبو حنیفة كتب حماد منی .

”ابو حنیفہ نے مجھ سے حماد بن ابی سلیمان کی کتابیں چوری کیں۔“ (الجرح والتعديل: ۵۰/۸)

اب یہاں عجیب الجھن پیدا ہو گئی ہے کہ اگر محمد بن جابر یمامی ”ثقة“ ہے تو امام صاحب پر چوری کا الزام عائد ہوتا ہے اور اگر امام صاحب کو بچائیں تو اس روایت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے!

② اگر یہ حدیث ”صحیح“ ہے تو بعض الناس قنوت وتر اور عیدین میں رفع الیدین کیوں کرتے ہیں؟

③ یہ روایت ”ضعیف“ ہونے کے ساتھ ساتھ عام ہے، جبکہ رکوع جاتے اور رکوع سے سر

اٹھاتے وقت رفع الیدین کے ثبوت والی احادیث خاص ہیں، لہذا خاص کو عام پر مقدم کیا جائے گا۔

اتنی سی بات بعض لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں!

④ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے رفع الیدین کرنا ”صحیح“ سند سے ثابت ہے۔ (السنن الكبرى للبيهقي: ۷۳/۲)

دلیل نمبر ۳: قال الامام ابن أبي شيبة: حدثنا ابن فضيل عن عطاء عن

سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: ترفع الأيدي في سبعة مواطن: اذا قام الى الصلاة، واذا رأى البيت، وعلى الصفا والمروة، وفي عرفات، وفي جمع وعند الجمار .

”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سات مقامات پر رفع الیدین کیا جاتا ہے: جب نماز کے لیے کھڑا ہو، جب بیت اللہ کو دیکھے، کوہ صفا اور کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں اور جمرات کے پاس۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: ۲۳۵/۲-۲۳۶)

تبصرہ: ① سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ عطاء بن السائب (حسن الحدیث) ”مختلط“ ہیں اور ابن فضیل نے ان سے اختلاط کے بعد روایت لی ہے۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عطاء بن السائب راوی ”مختلط“ ہیں۔ (الجرح والتعديل: ۳۳۴/۶)

امام احمد بن حنبل، امام ابو حاتم الرازی (الجرح والتعديل: ۳۳۴/۶) اور امام دارقطنی (العلل: ۱۸۶/۵)

رضی اللہ عنہ نے ان کو ”مختلط“ قرار دیا ہے۔

امام ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں: وما روى عنه ابن فضيل، ففيه غلط واضطراب .

”عطاء بن السائب سے جو کچھ ابن فضیل نے روایت کیا ہے، اس میں غلطیاں اور اضطراب ہے۔“

(الجرح والتعديل: ۳۳۴/۶)

یہ جرح مفسر ہے، لہذا سند ”ضعیف“ ہے، اس قول میں قنوت وتر اور عیدین کے رفع الیدین کا بھی ذکر نہیں ہے، وہ کیوں کیا جاتا ہے؟

② ابو حمزہ (عمران بن ابی عطاء القصاب ثقہ عند الجمہور) کہتے ہیں:

رأيت ابن عباس يرفع يديه اذا افتتح الصلاة واذا ركع واذا رفع رأسه من الركوع .
”میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو نماز شروع کرتے، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے ہوئے دیکھا۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۳۹/۸، وسندہ حسن)

اس روایت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نماز میں رفع الیدین کے قائل تھے۔

(ب) نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا رفع الیدین کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے

کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔

فائدہ : یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، لیکن اس کی سند بھی ”ضعیف“ ہے، اس میں

ابن ابی لیلیٰ راوی جمہور محدثین کے نزدیک ”ضعیف، سبیء الحفظ“ ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ضعيف ، سبيء الحفظ . ”ضعيف اور خراب حافظ والا ہے۔“ (التلخيص الحبير: ۲۲/۳)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: محمد بن عبد الرحمن بن أبي ليلى سبيء الحفظ ، لا

يحتج به عند أكثرهم . ”ابن ابی لیلیٰ خراب حافظ والا ہے، اکثر محدثین کے نزدیک قابل حجت

نہیں۔“ (تحفة الطالب: ۳۴۵)

امام طحاوی حنفی نے اس کو ”مضطرب الحديث جداً“ کہا ہے۔ (مشكل الآثار للطحاوی: ۲۲۶/۳)

انور شاہ کشمیری دیوبندی صاحب کہتے ہیں: فهو ضعيف عندی کما ذهب اليه الجمهور .

”وہ میرے نزدیک بھی ضعیف ہے، جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے۔“ (فيض الباری: ۱۶۸/۳)

② اس کی سند میں الحکم بن عتیبہ راوی ”مدلس“ ہے جو کہ ”عن“ سے روایت کر رہا ہے۔ امام عینی حنفی

نے بھی اس کو ”مدلس“ کہا ہے۔ (عمدة القاری: ۲۴۸/۳) نیز دیکھیں (اسماء المدلسين للسيوطي: ۹۶)

دلیل نمبر ⑩ : عباد بن زبیر سے روایت ہے: اَنَّ رسولَ اللہ صَلَّی اللہ علیہ

وَسَلَّمَ کان اذا افتتح الصَّلَاة رفع یدیه فی اَوَّل الصَّلَاة ، ثُمَّ لم یرفعهما فی شئٍ حتّٰی یفرغ .
”رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو رفع الیدین فرماتے ، پھر فارغ ہونے تک کسی بھی رکن

میں رفع الیدین نہیں فرماتے تھے۔“ (الخلافیات للبیہقی ، نصب الراية للزیلعی : ۴۰۴/۱)

تبصرہ : یہ حدیث موضوع (من گھڑت) ہے، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وہو

موضوع . ”یہ حدیث موضوع (من گھڑت) ہے۔“ (المنار المنیف : ص ۱۳۹)

① عباد تابعی کا تعارف مطلوب ہے کہ یہ کون ہے؟ عباد بن زبیر کے نام سے کئی راوی ہیں،

اس سے عباد بن عبد اللہ بن زبیر مراد لینا غلط ہے۔

② محمد بن اسحاق راوی کا تعین مطلوب ہے۔

③ اس کی سند میں حفص بن غیاث ”مدلس“ ہیں، جو ”عن“ سے روایت کر رہے ہیں، سماع کی

تصریح ثابت نہیں، لہذا سند ”ضعیف“ ہے۔

④ بعض الناس قنوت وتر اور عیدین میں رفع الیدین کیوں کرتے ہیں؟

⑤ یہ موضوع (من گھڑت) روایت عام ہے، جبکہ رکوع کو جاتے اور سر اٹھاتے وقت رفع

الیدین کی احادیث خاص ہیں، تعارض کے وقت خاص کو عام پر مقدم کیا جاتا ہے۔

دعوت فکر

دینی بھائیو اور بہنو! ہم نے جانبین کے دلائل پوری دیانت کے ساتھ ذکر کر دیئے ہیں، اب آپ کا دینی

فریضہ ہے کہ دونوں طرف کے دلائل کو غیر جانبداراری سے بنظر انصاف پڑھیں، پھر اللہ تعالیٰ سے ڈر کر فیصلہ

کریں کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ جو لوگ اللہ رب العالمین کے عذاب سے بے خوف و خطر ہو کر سنت رسول

ﷺ کی دشمنی میں یہ کہتے ہیں کہ رفع الیدین کا حکم دکھاؤ، رفع الیدین کی احادیث کو اللہ و رسول نے ”صحیح“ کہا

ہو، دس کاثبات اور اٹھارہ کی نفی دکھاؤ، رسول اللہ ﷺ نے خود اس کو سنت کہا ہو، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔

ایسے لوگ علم اور عقل و نقل سے بالکل عاری ہیں۔ مومنین کے راستہ کو چھوڑ کر کسی اور راستے کے راہی ہیں۔

نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں

ایک سنتِ مظلومہ غلامِ مصطفیٰ ظہیر امن پوری

نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت نفل ادا کرنا رسولِ کریم ﷺ کی قولی، فعلی اور تقریری سنت ہے، اس کے ثبوت پر احادیث صحیحہ ملاحظہ ہوں:

قولی احادیث

دلیل نمبر ①: سیدنا ابوسعید عبداللہ بن مغفل مرنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا: صَلُّوْا قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ ، قَالَ فِي الثَّلَاثَةِ : لِمَنْ شَاءَ ، كَرَاهِيَةً أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً .

”نمازِ مغرب سے پہلے (دو رکعتیں) پڑھو، (ایسا دو بار فرمایا)، تیسری بار فرمایا، جو چاہے (پڑھے)، اس بات کو نا پسند کرتے ہوئے کہ کہیں لوگ اس (نماز) کو (لازمی) سنت نہ بنالیں۔“

(صحیح بخاری: ۵۷۸/۱ ح: ۱۸۳ سنن ابی داؤد: ۱۲۸۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۷۸۵۲-۷۷۳ھ) لکھتے ہیں: لَمْ يَرِدْ نَفْيُ اسْتِحْبَابِهَا لِأَنَّ لَا يُمْكِنُ أَنْ يَأْمُرَ بِمَا لَا يَسْتَحَبُّ ، بَلْ هَذَا الْحَدِيثُ مِنْ أَقْوَى الْأَدَلَّةِ عَلَى اسْتِحْبَابِهَا .

”(اس حدیث سے) آپ ﷺ کی مراد مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے استحباب کی نفی نہیں، اس لیے کہ یہ ناممکن بات ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک چیز کے بارے میں حکم فرمائیں اور وہ (کم از کم) مستحب (بھی) نہ ہو، بلکہ یہ حدیث تو مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے استحباب پر قوی ترین دلیلوں میں سے ایک ہے۔“

(فتح الباری فی شرح صحیح البخاری: ۶۰/۳)

دلیل نمبر ②: سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے ہی سنن ابی داؤد (۱۸۲/۸ ح: ۱۲۸۱)

وسندہ حسن) میں یہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صَلُّوْا قَبْلَ الْمَغْرِبِ رَكَعَتَيْنِ ...

”نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھو۔“

دلیل نمبر ③: سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا: بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ ، ثَلَاثًا ، لِمَنْ شَاءَ .

”(رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا) ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، تیسری بار فرمایا، اس کے لیے جو

پڑھنا چاہے۔“ (صحیح بخاری: ۸۷/۱، ح: ۶۲۴، صحیح مسلم: ۲۸۷/۱، ح: ۸۳۸، سنن ابی داؤد: ۱۸۲/۱، ح: ۱۲۸۳، سنن ترمذی:

۴۵/۱، ح: ۱۸۵، سنن ابن ماجہ: ۸۲/۱، ح: ۱۱۶۲، سنن نسائی: ۲۸/۲، ح: ۶۸۲، مسند الامام احمد: ۸۶/۴)

پہلی اذان سے مراد اذان اور دوسری اذان سے مراد اقامت ہے۔

مغرب سے پہلے دو رکعت نفل کے جواز پر یہ تیسری قولی حدیث ہے، کیونکہ اس میں بلا استثناء پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے، محدثین کرام رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہی مسئلہ ثابت کیا ہے۔

دلیل نمبر ۴ : سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ما من صلاة مفروضة الا وبين يديها ركعتان .

”کوئی فرضی نماز ایسی نہیں ہے، جس سے پہلے دو رکعتیں نہ ہوں۔“

(سنن الدارقطنی: ۲۶۷/۱، ح: ۱۰۳۴، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۲۳۵۵) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

اس حدیث میں بھی بلا استثناء ہر فرض نماز سے پہلے دو رکعتوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

فعلی حدیث

دلیل نمبر ۵ : سیدنا عبداللہ مرفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی قبل المغرب ركعتين .

”رسول اللہ ﷺ نے (خود) مغرب سے پہلے دو رکعتیں ادا فرمائیں۔“

(صحیح ابن حبان: ۱۵۸۸، قیام اللیل للمروزی: ۶۴، وسندہ صحیح)

اس روایت کے بارے میں علامہ مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ سند امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔“ (اختصار قیام اللیل للمقریزی: ۶۴)

تقریری احادیث

دلیل نمبر ۶ : قال مرثد بن عبد اللہ الیزنی: أتیت عقبہ بن عامر

الجهنّی، فقلت: ألا أعجّبک من أبی تمیم؟ یرکع رکعتین قبل صلاة المغرب، فقال عقبہ: ان

کنّا نفعله علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقلت: فما یمنعک الآن؟ قال: الشغل .

”مرشد بن عبداللہ یزنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں (صحابی رسول) سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، کیا میں آپ کو ابو تمیم رضی اللہ عنہ (تابعی) کی وجہ سے تعجب میں نہ ڈالوں؟ وہ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے ہیں، اس پر سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ (مغرب سے پہلے دو رکعتوں کا اہتمام) کرتے تھے، میں نے عرض کی، اب آپ کو کس چیز نے روک دیا ہے؟ فرمایا، مصروفیت نے۔“ (صحیح بخاری: ۱۵۸/۱، ج: ۱۷۸۴)

علامہ سندھی خفی (م ۱۱۳۹ھ) لکھتے ہیں: والظاہر أَنَّ الرَّكَعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ جَائِزَتَانِ ، بَلْ مَنُودَوْبَتَانِ ، وَلَمْ أَرِ لِلْمَانِعِينَ جَوَابًا شَافِيًا .

”ظاہر ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعتیں جائز، بلکہ مستحب ہیں، میں منع کرنے والوں کے پاس کوئی شافی جواب نہیں پاسکا۔“ (حاشیہ السندی علی النسائی: ۲۸۳/۲، ۲۸۷/۲)

علامہ محمد طاہر پٹنی خفی (م ۹۸۶ھ) فرماتے ہیں: الْأَصَحُّ أَنَّهُ يَسْتَحَبُّ الرَّكَعَتَانِ قَبْلَهُ وَعَلَيْهِ السَّلَفُ . ”صحیح ترین بات یہ ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعتیں مستحب ہیں اور ان پر سلف صالحین کا عمل رہا ہے۔“ (تکملة مجمع بحار الانوار: ۱۰۶/۴)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَفِيهِ رَدٌّ عَلَى قَوْلِ الْقَاضِي أَبِي بَكْرٍ بْنِ الْعَرَبِيِّ : لَمْ يَفْعَلْهُمَا أَحَدٌ بَعْدَ الصَّحَابَةِ ، لِأَنَّ أَبَا تَمِيمٍ تَابِعِيٌّ ، وَقَدْ فَعَلَهُمَا ...

”اس حدیث میں قاضی ابوبکر بن العربی کے اس قول کا رد ہوتا ہے کہ یہ دو رکعتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد کسی نے نہیں پڑھیں، کیونکہ ابو تمیم رضی اللہ عنہ تابعی ہیں اور انہوں نے یہ دو رکعتیں ادا کی ہیں۔“ (فتح الباری: ۶۰/۲)

دلیل نمبر ⑤ : قَالَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ : كُنَّا نَصَلِّي عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكَعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ ، فَقُلْتُ لَهُ : أَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّاهُمَا ؟ قَالَ : كَانَ يَرَانَا نَصَلِّيَهُمَا ، فَلَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا .

”سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں غروب آفتاب کے بعد اور نماز مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے، (راوی مختار بن قفل تابعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے عرض کی، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دو رکعتیں پڑھتے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ دو رکعتیں پڑھتے دیکھتے تھے، لیکن نہ ہمیں (واجبی) حکم دیتے تھے، نہ ہی منع کرتے تھے۔“ (صحیح مسلم: ۲۷۸/۱، ج: ۸۳۶)

دلیل نمبر ۸ :

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

صَلَّيْتُ الرَّكَعَتَيْنِ قَبْلَ الْمَغْرَبِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .
”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔“

(سنن ابی داؤد : ۱۸۹/۱ ح : ۱۲۸۲ ، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۹ :

عن أنس بن مالك ، قال : كان المؤذن إذا أذن قام ناس

من أصحاب النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يبتدرون السَّوَارِي حَتَّى يَخْرُجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُمْ كَذَلِكَ يَصَلُّونَ رَكَعَتَيْنِ قَبْلَ الْمَغْرَبِ ، وَلَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ شَيْءٌ .

”سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب مؤذن اذان (مغرب) کہتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے (کبار) صحابہ کرام ستونوں کی طرف ایک دوسرے سے سبقت کرتے ، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ، وہ (صحابہ) اسی حالت میں مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے ، اذان اور اقامت کے درمیان کثیر وقت

نہیں ہوتا تھا۔“ (صحیح بخاری : ۸۷/۱ ح : ۶۲۵ ، صحیح مسلم : ۲۸۷/۱ ح : ۸۳۷)

صحیح مسلم میں یہ الفاظ زائد بیان ہوئے ہیں :
حَتَّى إِنَّ الرَّجُلَ الْغَرِيبَ لِيَدْخُلَ
المسجد ، فيحسب أنَّ الصَّلَاةَ قَدْ صَلَّيْتُ ، مِنْ كَثْرَةِ مَنْ يَصَلِّيْهَا .

”یہاں تک کہ کوئی اجنبی (مسافر) مسجد میں داخل ہوتا تو وہ مغرب سے پہلے دو نفل پڑھتے والوں کی کثرت کو دیکھ کر یہ خیال کرتا کہ نماز مغرب پڑھی جا چکی ہے۔“

دلیل نمبر ۱۰ :

زربن حیش کہتے ہیں :
انَّ أَبِي بَنِ كَعْبٍ وَعَبْدَ الرَّحْمَنِ

ابن عوف كانا يصليان قبل المغرب ركعتين ركعتين .

”سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما دونوں مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ادا

فرماتے تھے۔“ (شرح مشکل الآثار للطحاوی : ۱۲۷/۱۴ ، وسندہ حسن)

دلیل نمبر ۱۱ :

عبداللہ بن ابی الہذیل کہتے ہیں :
دعوت رجلاً من

أصحاب النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى مَنْزِلِي ، فَلَمَّا أَدْنَى الْمُؤَذِّنُ الْمَغْرَبَ ، فَصَلَّيْتُ ، فَسَأَلْتُ عَنْ ذَلِكَ ، فَقَالَ : كَانَ أَبِي بَنِ كَعْبٍ يَصَلِّيْهُمَا .

”میں نے ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں دعوت دی ، جب مؤذن نے مغرب کی اذان کہی تو

انہوں نے دو رکعتیں پڑھیں، میں نے ان سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا، سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یہ دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔“ (مسند المسدد بحوالہ المطالب العالیۃ لابن حجر: ۶۲۱، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۱۲: امام حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: حسنستان جمیلتان لمن أراد اللہ بہما۔

”جو آدمی ان دو رکعتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ادا کرے، اس کے لیے بہت بہترین اور اچھی ہیں۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۵۶/۲، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۱۳: حکم بن عتیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رأیت ابن ابی لیلیٰ صلی رکعتین قبل المغرب۔ ”میں نے ابن ابی لیلیٰ کو دیکھا کہ انہوں نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں ادا کیں۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۵۵/۲، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۱۴: امام ترمذی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وقال أحمد واسحاق: ان صلاهما فحسن، وهذا عندهما على الاستحباب۔

”امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے، اگر آدمی یہ دو رکعتیں ادا کر لے تو اچھا ہے، یہ دو رکعتیں ان کے نزدیک مستحب ہیں۔“ (جامع ترمذی، تحت حدیث: ۱۸۵)

قارئین کرام! ان صحیح احادیث اور آثار صحیحہ سے نماز مغرب سے پہلے دو رکعتوں کا استحباب ثابت ہوتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ان پر عمل ہونا چاہیے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا آتَاكُم الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: ۷)

”جو تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے دیں، اسے پکڑ لو، اور جس سے وہ منع فرمادیں، اس سے رک جاؤ۔“ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیاری سنت سے منع کرتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور آج سے ہی اس سنت پر عمل کرنا چاہیے، سنت کی پیروی ہی محبت رسول کی حقیقی علامت ہے۔

اب ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ان لوگوں کے دلائل کا علمی اور تحقیقی جائزہ پیش کرتے ہیں، جو ان دو رکعتوں کے استحباب کے قائل نہیں ہیں اور محض اپنے امام کے بے سند اور ”ضعیف“ قول کے مقابلہ میں ان احادیث صحیحہ و آثار کی تاویل یا رد کرتے ہیں۔

مانعین کے دلائل اور ان کا جائزہ

دلیل نمبر ① : عن طاؤس قال : سئل ابن عمر عن الرّكعتين قبل المغرب ، فقال : ما رأيت أحداً على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلّيهما ، ورخص في الرّكعتين بعد العصر .

”طاؤس کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا، میں نے اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں کسی کو یہ دو رکعتیں پڑھتے نہیں دیکھا، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عصر کے بعد دو رکعتوں پڑھنے کی اجازت دی۔“ (سنن ابی داؤد: ۱۸۲/۱ ح: ۱۲۸۴، مسند عبد بن حمید: ۱۰۵، ح: ۸۰۴ مختصراً السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۷۶/۲، وسندہ حسن)

تبصرہ : یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مغرب سے پہلے کسی کو نفل نماز پڑھتے نہیں دیکھا، جبکہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے دیکھا ہے، حجت اس کی بات ہوگی، جس نے دیکھا ہے نہ کہ اس کی بات جس نے نہیں دیکھا، یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ مثبت اور منفی میں تعارض ہو تو مثبت کو ترجیح ہوتی ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

القول فی مثل هذا قول من شاهد دون من لم يشاهد ...
”اس طرح کے (تعارض) میں اس شخص کی بات حجت ہوگی، جس نے مشاہدہ کیا ہے، نہ کہ اس کی جس نے مشاہدہ نہیں کیا۔“

تنبیہ : یہاں پر بطور فائدہ عرض ہے کہ بعض الناس اس روایت کو پیش کرتے وقت اس کا آخری حصہ ترک کر دیتے ہیں کہ: ”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کی اجازت دی“ کیونکہ یہ ان کے خلاف ہے، یہ بدترین خیانت اور دین میں تحریف ہے۔

فائدہ : قتادہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں، میں نے امام سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے کہا کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے، انہوں نے کہا، وہ تو ان دو رکعتوں سے منع کرتے تھے، میں نے سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے سوا کسی صحابی کو یہ دو رکعتیں پڑھتے نہیں دیکھا۔“ (مشکل الآثار للطحاوی: ۱۲۲/۴)

اس کی سند ”ضعیف“ ہے، اس کے راوی ہارون بن کامل کی توثیق نہیں مل سکی، ابن یونس مصری نے اسے

اپنی تاریخ میں بغیر توثیق کے ذکر کیا ہے۔

دلیل نمبر ۲ : قال عبدالرزاق عن الثوري عن منصور عن ابراهيم ،

قال : لم يصل أبوبكر ولا عمر ولا عثمان الركعتين قبل المغرب .

”ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں نہیں پڑھیں۔“

(مصنف عبدالرزاق: ۴۳۵/۲: ۳۹۸۵)

تبصرہ : یہ روایت کئی وجوہ سے ”ضعیف“ ہے:

(۱) امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی ”مدلس“ ہیں اور سماع کی تصریح ثابت نہیں ہے۔

(۲) امام ابراہیم نخعی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات اور سیدنا عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے

ہیں، لہذا یہ روایت سخت ”منقطع“ ہے، ”منقطع“ سے حجت لینا صحیح ہیں۔

فائدہ : المطالب العالیہ لابن حجر (۶۲۳) میں ہے:

قال مسدد : حدثنا يحيى عن سفيان ، حدثني منصور عن أبيه ، قال

منصور کے باپ کے حالات نہیں مل سکے، لہذا سند مردود ہے۔

دلیل نمبر ۳ : عن حماد قال : سألت ابراهيم عن الصلاة قبل المغرب ،

فنهاني عنها وقال : انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأبوبكر وعمر لم يصلوها .

”حماد بن ابی سلیمان سے روایت ہے، کہتے ہیں، میں نے امام ابراہیم نخعی سے مغرب سے پہلے نماز کے

بارے میں سوال کیا تو آپ نے مجھے اس سے منع فرمادیا اور کہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے یہ نماز

نہیں پڑھی۔“ (کتاب الآثار للامام ابی حنیفہ بروایۃ محمد: ۳۲)

تبصرہ : یہ موضوع (من گھڑت) روایت ہے، اس کا راوی محمد بن حسن شیبانی بالاتفاق

”ضعیف“ اور ”کذاب“ ہے، اسے امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے مجروح قرار دیا ہے۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: محمد جہمی کذاب . ”محمد (بن حسن شیبانی) جہمی

(گمراہ فرقے کا) اور کذاب (پر لے درجے کا جھوٹا) ہے۔“ (الضعفاء للعقيلي: ۵۲/۴ وسندہ صحیح)

نیز فرماتے ہیں: ليس بشيء . ”یہ کچھ بھی نہیں ہے۔“ (تاریخ ابن معین: ۱۷۷)

انہوں نے محمد بن حسن کو ”ضعیف“ بھی قرار دیا ہے۔ (الکامل لابن عدی: ۱۷۴/۶، وسندہ صحیح)

مزید فرماتے ہیں: اجتماع الناس على طرح هؤلاء النفر، ليس يذاكر بحديثهم، ولا يعتمد بهم، منهم محمد بن الحسن ...

پرتفاق ہو گیا ہے، ان کی احادیث کا مذاکرہ نہیں کیا جاتا اور نہ ہی ان پر اعتماد کیا جاتا ہے، ان (متروک) راویوں میں سے ایک محمد بن حسن ہے۔ (الکامل لابن عدی: ۱۷۵/۶، وسندہ صحیح)

امام اہل سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لا أروى عنه شيئا. ”میں اس

سے کوئی روایت نہیں لیتا۔“ (الجرح والتعديل: ۲۷/۷، وسندہ صحیح)

رسول اللہ ﷺ کی پیاری سنت کے خلاف ایسے جھوٹے راوی کی روایت پیش کرنا دین اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

(ب) حماد بن ابی سلیمان آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، امام ابن سعد لکھتے ہیں:

اختلط في آخر أمره. ”یہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔“ (تہذیب التہذیب: ۱۵/۳)

حافظ بیہقی رحمہ اللہ (م ۸۰۷ھ) لکھتے ہیں: ولا يقبل من حديث حماد إلا ما رواه عنه

القدماء: شعبة، وسفيان الثوري، والذستوائي، ومن عدا هؤلاء روى عنه بعد الاختلاط.

”حماد بن ابی سلیمان کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی، سوائے اس حدیث کے جو ان سے قدیم شاگرد،

شعبہ، سفیان ثوری، دستوائی رحمہ اللہ بیان کریں، ان کے علاوہ سارے لوگوں نے ان سے اختلاط کے بعد روایت

لی ہے۔“ (مجمع الزوائد: ۱۱۹/۱-۱۲۰)

امام ابو حنیفہ بھی حماد کے ان شاگردوں میں سے ہیں، جنہوں نے ان سے اختلاط کے بعد سماع کیا ہے،

لہذا یہ روایت ”ضعیف“ و مردود ہے، اس میں نعمان بن ثابت راوی بھی بالاتفاق ”ضعیف و متروک“ ہے۔

امام زبیلی حنفی (م ۷۲۲ھ) نے بھی اس روایت کو ”معطل“ (سخت منقطع) قرار دیا ہے۔

(نصب الراية في تخريج احاديث الهداية: ۱۴۷/۲)

دلیل نمبر ۴: قال الطبرانی: حدثنا يحيى بن صاعد، ثنا محمد بن منصور

المكّي، ثنا يحيى بن أبي الحجاج، ثنا عيسى بن سنان عن رجاء بن حيوة عن جابر، قال: سألتنا

نساء رسول الله صلى الله عليه وسلم: هل رأيتن رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي

الرَّكَعَتَيْنِ قَبْلَ الْمَغْرَبِ ؟ فَقُلْنَ : لَا ، غَيْرَ أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ قَالَتْ : صَلَّاهُمَا عِنْدِي مَرَّةً ، فَسَأَلْتُهُ : مَا هَذِهِ الصَّلَاةُ ؟ فَقَالَ : نَسِيتُ الرَّكَعَتَيْنِ قَبْلَ الْعَصْرِ ، فَصَلَّيْتُهُمَا الْآنَ .

”سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں، ہم نے نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات سے سوال کیا، کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں، سوائے اس کے کہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا، آپ نے ایک دفعہ یہ دو رکعتیں میرے ہاں پڑھی تھیں، میں نے پوچھا، یہ کیسی نماز ہے؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، میں عصر سے پہلے دو رکعتیں ادا کرنا بھول گیا تھا تو اب ان کو ادا کیا ہے۔“ (مسند الشاميين للطبرانی: ۲/۲۱۲، ح: ۲۱۱۰)

تبصرہ : یہ روایت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس کی سند میں عیسیٰ بن سنان الحنفی راوی جمہور کے نزدیک ”ضعیف“ ہے، حافظ عراقی رحمہ اللہ (۷۲۵-۸۰۶ھ) فرماتے ہیں: ضَعْفُهُ الْجَمْهُورُ .

”اس کو جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔“ (المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار: ۲/۲۰۸)

حافظ بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَضَعْفُهُ الْجَمْهُورُ . ”اسے جمہور نے ضعیف کہا ہے۔“ (مجمع الزوائد: ۳۶۸)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اسے ”لَیِّنُ الْحَدِيثِ“ قرار دیتے ہیں۔ (تقریب التہذیب: ۵۲۹۵) اس روایت کے دوسرے راوی یحییٰ بن ابی الحجاج کو بھی حافظ ابن حجر نے ”لَیِّنُ الْحَدِيثِ“ لکھا ہے۔ (التقریب: ۷۵۲۷)

دلیل نمبر ۵ : عن ابن المسيب ، قال : كان المهاجرون لا يركعون قبل المغرب وكانت الأنصار تركع بهما .

”سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ مہاجرین صحابہ کرام مغرب سے پہلے دو رکعتیں نہیں پڑھتے تھے، جبکہ انصار پڑھتے تھے۔“

تبصرہ : (۱) یہ روایت امام زہری رحمہ اللہ کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، اس کی صحت کے مدعی پر سماع کی تصریح لازم ہے۔

(۲) انصار صحابہ کا ان دو رکعتوں کو ادا کرنا تو ان کے مستحب ہونے کی واضح دلیل ہے، مہاجرین کے نہ پڑھنے سے وجوب کی نفی ہوتی ہے، جس کے ہم بھی قائل نہیں۔

دلیل نمبر ۶ : عن عبد الله بن بريدة عن أبيه ، قال : قال رسول الله

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَنَّ عِنْدَ كُلِّ أَذَانَيْنِ رَكَعَتَيْنِ مَا خَلَا صَلَاةَ الْمَغْرَبِ .

”عبداللہ بن بریدہ اپنے باپ (بریدہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بے شک ہر دو اذانوں (اذان اور تکبیر) کے درمیان دو رکعتیں (مستحب) ہیں، سوائے مغرب کی نماز کے۔“

(سنن الدارقطنی : ۳۶۵/۸ ح : ۱۰۲۸ مسند البزار : ۳۳۴/۸)

تبصرہ : (۱) یہ روایت حیان بن عبید اللہ (حسن الحدیث عند الجمہور) کے اختلاط

کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ذکر الصلّٰت منه الاختلاط .

”صلت نے اس سے اختلاط کو ذکر کیا ہے۔“ (لسان المیزان : ۳۷۰/۲، التاريخ الكبير : ۵۸/۳)

یہ حدیث بھی اس کا اختلاط ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی سند و متن کو خطا پر مبنی قرار دیا ہے۔

(معرفة السنن والآثار للبيهقي : ۹/۴)

حافظ بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ذکرہ ابن عدی ، وقیل : انه اختلط .

”اس (حیان بن عبید اللہ) کو امام ابن عدی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، کہا گیا ہے کہ یہ اختلاط کا شکار ہو گیا

تھا۔“ (مجمع الزوائد : ۲۳۷۲)

حافظ ابن ملقن رحمہ اللہ نے ”ما خلا صلاة المغرب“ کی زیادت کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔

(البدر المنير لابن الملقن : ۲۹۴/۴)

(ب) عبداللہ بن بریدہ رحمہ اللہ خود مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں رسول اللہ

ﷺ کا حکم بیان کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری : ۱۵۷/۸ ح : ۱۱۸۳)

نیز وہ خود یہ نماز پڑھتے بھی تھے۔ (صحیح ابن خزيمة : ۱۲۸۷، صحیح ابن حبان : ۱۵۵۹، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ⑤ : سیدنا ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: صَلُّوا الْمَغْرِبَ لِفَطْرِ الصَّائِمِ وَبَادِرُوا طُلُوعَ النُّجُومِ .

”مغرب (کی نماز) روزہ دار کے افطار کے وقت پڑھو اور ستاروں کے طلوع ہونے سے سبقت لے

جاؤ (یعنی پہلے ہی نماز پڑھ لو)۔“ (مسند الامام احمد : ۴۲/۴)

تبصرہ : یہ روایت ”رجل“ مبہم کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

دلیل نمبر ⑧ : سیدنا ابوالیوب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے

ہوئے سنا: صَلَّوْا صَلاۃَ الْمَغْرِبِ مَعَ سِقُوطِ الشَّمْسِ ، بَادِرُوا بِهَا طُلُوعَ النُّجُومِ .
 ”مغرب سورج کے غروب ہوتے ہی پڑھ لو، اس کے پڑھنے میں ستاروں کے طلوع ہونے سے سبقت
 لے جاؤ۔“ (المعجم الكبير للطبرانی : ۱۷۶/۴)

تبصرہ : ان دونوں روایتوں میں نمازِ مغرب جلدی پڑھنے کا حکم ہے، اس نے نمازِ مغرب
 سے پہلے دو رکعتوں کی نفی یا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا۔

مغرب کی اذان بھی تو سورج کے غروب ہونے کے بعد ہی کہی جاتی ہے، اگر اچھے طریقے سے کہی
 جائے تو چار پانچ منٹ اذان پر صرف ہو جاتے ہیں، اب اگر کوئی اس روایت کو لے کر مغرب کی اذان نہ کہنے کا
 شوشہ کھڑا کر دے تو کیا وہ حق بجانب ہوگا؟

سیدھی سی بات ہے کہ جس ہستی نے مغرب کی نماز جلدی پڑھنے کا حکم دیا ہے، اسی نے مغرب سے پہلے
 دو رکعتوں کا حکم دیا ہے، خود بھی پڑھ کر دکھائی ہیں، نیز اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھتے ہوئے دیکھا تو اظہارِ
 رضامندی فرمایا ہے۔

پھر دو رکعتوں کے پڑھنے میں بھلا کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کی نماز
 شروع پڑھنے میں اتنی تاخیر نہ کرو کہ ستارے ظاہر ہو جائیں، اگر جلدی میں دو رکعتیں پڑھ لی جائیں تو ستارے
 کہاں ظاہر ہوتے ہیں؟

جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازِ مغرب میں قصاصِ مفصل (چھوٹی چھوٹی آخری سورتوں) کی قراءت ثابت
 ہے (سنن النسائي: ۱۷۶/۲، ح: ۹۸۳-۹۸۴، وسندہ حسن)، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ طور کی قراءت بھی ثابت
 ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۰۵/۱، ح: ۷۶۵، صحیح مسلم: ۱۸۷/۱، ح: ۴۶۳)

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ فِي
 صَلاۃِ الْمَغْرِبِ بِسُورَةِ الْأَعْرَافِ ، فَرَقَّهَا فِي رَكَعَتَيْنِ . ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ مغرب میں سورہ
 اعراف پڑھی، اس کو دو رکعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔“ (سنن النسائي: ۱۵۴/۱، ح: ۹۹۱، وسندہ صحيح)

سورہ طور اور سورہ اعراف کی تلاوت کرنے کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ مغرب یقیناً تاخیر سے ادا
 نہیں ہوئی تھی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو نمازِ عین وقت پر پڑھتے تھے، کیا دو رکعتیں اس سے بھی زیادہ وقت لیتی ہیں؟
 حافظ نووی رحمۃ اللہ علیہ (۶۳۱-۶۷۷ھ) لکھتے ہیں:
 والمختار استحبابها لهذه الأحاديث

الصَّحِيحة الصَّرِيحة . ”ان صحیح و صریح احادیث کی روشنی میں مختارات یہ ہے کہ مغرب سے پہلے (دور کعت) نماز مستحب ہے۔“ (شرح صحیح مسلم للنووی: ۲۷۸)

نیز لکھتے ہیں: وَأَمَّا قَوْلُهُمْ : يُوْذَى إِلَى تَأْخِيرِ الْمَغْرَبِ ، فَهَذَا خِيَالٌ مُنَابِذٌ لِلسَّنَةِ ، فَلَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهِ ، وَمَعَ هَذَا فَهُوَ زَمَنٌ يَسِيرٌ ، لَا تَتَأَخَّرُ بِهِ الصَّلَاةُ عَنْ أَوَّلِ وَقْتِهَا ، وَأَمَّا مَنْ زَعَمَ النَّسْخَ ، فَهُوَ مُجَازِفٌ ، لِأَنَّ النَّسْخَ لَا يَصَارُ إِلَيْهِ إِلَّا إِذَا عَجَزْنَا عَنْ التَّأْوِيلِ وَالْجَمْعِ بَيْنَ الْأَحَادِيثِ وَعَلِمْنَا التَّارِيخَ ، وَلَيْسَ هُنَا شَيْءٌ مِنْ ذَلِكَ .

”رہا ان (منکرین سنت) کا یہ کہنا کہ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا مغرب کو لیٹ کر دیتا ہے، تو یہ سنت دشمنی پر مبنی خیال ہے، اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا، نیز ان دو رکعتوں کی ادائیگی میں تھوڑا سا وقت لگتا ہے، جس سے نماز اول وقت سے لیٹ نہیں ہوتی، جس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ نماز منسوخ ہے، وہ بے تکی اور بے اصولی باتیں کرنے والا ہے، کیونکہ منسوخیت کا دعویٰ تو تب ہوگا، جب ہم حدیثوں کی تاویل اور ان کے درمیان جمع و تطبیق سے عاجز آجائیں اور ہمیں تاریخ کا علم ہو جائے، جبکہ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

(شرح مسلم للنووی: ۲۷۸/۱) نیز دیکھیں (السَّعَايَةُ اِزْ عَبْدِ الْحَيِّ الْكَنْوِيُّ الْحَنْفِيُّ: ۳۷/۲)

برصغیر کے مشہور حنفی عالم جناب عبداللہ لکھنوی (۱۲۶۳-۱۳۰۴ھ) حافظ قسطلانی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مجموع الأحادیث تدل علی استحباب تخفيفها كركعتي الفجر .

”احادیث کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعتوں کو فجر کی نماز سے پہلے والی دو رکعتوں کی طرح تخفیف سے پڑھا جائے۔“ (السَّعَايَةُ: ۲۹/۲)

علامہ کرمانی حنفی بھی اس نماز کے استحباب کے قائل ہیں۔ (شرح الکرمانی: ۲۳/۵)

جناب محمود الحسن دیوبندی اسیر الما (۱۳۳۹ھ) کہتے ہیں: ”ہاں! اگر بلا تاخیر مغرب

نوافل پڑھ سکے یا کسی وجہ سے جماعت میں دیر ہو تو جائز ہے۔“ (تقاریر «شیخ الہند»: ۲۴۴۰: ۵۲)

الحاصل: مغرب سے پہلے دو نفل مستحب ہیں، کراہت پر کوئی دلیل نہیں ہے، دعا ہے کہ اللہ

رب العزت ہمیں نبی کریم ﷺ کی سنتوں سے محبت کرنے والا بنائے۔ آمین!



صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکارِ حدیث

دفاعِ حدیث

حدیثِ افک پر اعتراضات اور ان کے جوابات ۴

اعتراض نمبر ۱۵ : ”اس افسانہ کے فرضی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ

ام المؤمنین حضرت جویریہ بنتِ حارثؓ سے حضور اکرم ﷺ نے غزوہ بنی مصطلق سے واپس ہو کر ہی عقد فرمایا ہے۔۔۔ محمد بن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ اولاً جویریہ خطیبِ اسلام حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئی تھیں، یعنی مالِ غنیمت تقسیم کرتے وقت آپ نے جویریہ ثابت کو بخش دی تھیں، حضرت جویریہ نے ثابت سے کتابت کا معاملہ کر لیا، یعنی یہ کہ میں آپ کو اس قدر رقم دے دوں گی، آپ مجھے آزاد کر دیں، ثابت نے فوراً منظور کر لیا۔۔۔ جویریہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں بنی مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی ہوں اور مشرف بہ اسلام ہوں، ثابت بن قیس نے جس کے حصہ میں میں آئی ہوں، مجھے مکاتیب کر دیا ہے، مجھے ثابت کو وہ رقم ادا کرنی ہے، آپ نے فرمایا، اگر تمہیں منظور ہو تو وہ پوری رقم میں ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں، حضرت جویریہ نے عرض کیا، مجھے بالکل منظور ہے، آپ نے ثابت کو رقم ادا کر دی اور ان سے نکاح کر لیا۔۔۔

پس اگر غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر حضرت صدیقہ پر بہتان لگنے کا واقعہ ہوا ہوتا تو یہ زمانہ تو حضور اکرم ﷺ کے لیے شدید رنج و غم کا تھا، جو زہری کی روایت کے مطابق ایک ماہ تک چلا ہے، تو کیا ایسے رنج و غم کے زمانے میں حضور اکرم ﷺ نکاح فرماتے؟ شادی و ناشادی تو ایک دوسرے کی نفیض ہیں، ان کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۱۷۰-۱۷۱)

جواب : ① قارئین کرام! شادی و ناشادی یقیناً ایک دوسرے کی نفیض ہیں اور ان کا

اجتماع نہیں ہو سکتا، لیکن اس حدیث میں تو اس اجتماع کا اشارہ تک موجود نہیں، کیا کوئی منکرِ حدیث کسی حدیث سے ہمیں یہ دکھا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عین اسی زمانے میں سیدہ جویریہؓ سے شادی فرمائی تھی جب آپ ﷺ سیدہ عائشہؓ پر لگائے جانے والے بہتان کے رنج و غم میں مبتلا تھے؟

واقعہ یہ ہے سیدہ جویریہؓ سے شادی یا تو سفر میں ہو گئی تھی یا سفر سے واپسی کے فوراً بعد ہوئی ہے، جب ابھی تک منافقین اپنے پروپیگنڈے کو ہوا دینے کی کوشش میں تھے اور رسول کریم ﷺ اس سے واقف نہ ہوئے تھے، میرٹھی صاحب کا کوئی جانشین ہمت کر کے کسی ایک روایت میں دونوں واقعات کا اجتماع ثابت کرے۔

مرد چور ہو اور اس کے اعزاء و اقربا، بھائی، بہن، اولاد، ماں، باپ، دادا، دادی چور نہ ہوں تو اسی چور مرد سے نفرت کی جاتی ہے اور اسے ہی گری ہوئی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، اس کے اعزاء و اقربا سے محض اس کے جرم کی وجہ سے نفرت نہیں کی جاتی، الا یہ کسی طرح اس چور کی اعانت و حمایت کرتے ہوں۔۔۔۔

لیکن زنا ایسا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے پیدا شدہ نفرت و تحارت زانی و زانیہ کے اصول و فروع اور اہل و عیال کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، زانیہ عورت کے جرم کی وجہ سے اس کے ماں، باپ، دادا، دادی کی، اس کے شوہر کی، اس کی اولاد کی بھی بے عزتی ہوتی ہے۔۔۔۔

پس جس طرح کوئی بھی نبی کبھی جرم زنا کا مرتکب نہیں ہوا، اسی طرح کسی نبی کے والدین اور بھائیوں، بہنوں اور اہل و عیال سے بھی کوئی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔

نبی کی بیوی کا فرہ ہو سکتی تھی، مگر زانیہ نہیں، نبی کے بیٹے یا بیٹی سے کفر کا صدور ہو سکتا تھا، مگر زنا کا نہیں، نبی کے ماں باپ مبتلائے کفر ہو سکتے تھے، مگر ان کا مبتلائے زنا ہونا ممکن نہ تھا، پس حضور ﷺ کی طرح آپ کی تمام ازواج مطہرات اور جملہ بناتِ طہیات کے لیے بھی عصمت تکوینی طور پر مقدر و لازم کر دی گئی تھی، جیسے تکوینی طور پر ہر زندہ انسان کے لیے سانس لینا لازم و مقدر کر دیا گیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کو اس امر میں اپنے نبی کی عصمت اس قدر عزیز رہی ہے کہ کسی بے ہودہ شخص یا اشخاص نے اگر کسی نبی کی ذات یا نبی سے قرابتِ قریبہ رکھنے والی کسی ہستی کی عفت پر الزام لگایا تو علی الفور اس قدر واضح طریق سے اس کی تردید فرمادی جیسے بے ابردن میں نصف النہار کا سورج واضح ہوتا ہے۔

عزیز مصر کی بیوی نے اپنے شوہر کے سامنے اپنے بچاؤ کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام پر ارادہ بد کا الزام لگایا تو علی الفور عزیز کے سامنے اس کی پول کھول دی گئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کنواری مریم صدیقہ کی گود میں دیکھ کر لوگ پھر گئے اور ان پر الزام رکھنے لگے تو علی الفور حق تعالیٰ نے شیر خوار مسیح بن مریم کی زبان پر وہ بنجیدہ و باوقار تقریر جاری فرمادی جسے سن کر سب لوگ مبہوت رہ گئے اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ حضرت مریم کے معتقد بن گئے، بلکہ انبیائے کرام کے علاوہ نیک و صالح بندوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی یہ نوازش رہتی ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ایک عابد و زاہد جرتج نامی شخص کا قصہ مذکور ہے جو خود حضور ﷺ کا بیان فرمودہ ہے کہ شیر خوار بچہ نے جو اپنی حرام کارماں کی گود میں تھا، برملا جرتج کی بے گناہی ظاہر کر دی اور عامۃ الناس یہ کرامت دیکھ کر جرتج کے بے حد معتقد ہو گئے، پس اگر ام المؤمنین پر الزام لگایا گیا ہوتا تو سنت اللہ

تعالیٰ سنتِ انبیاء کے مطابق علی الفور کوئی ایسی ہی قطعی اور غیبی نشانی رونما فرمادیتا جس سے اس بہتان کے پرچے اڑ جاتے، ایک ماہ تک مسلسل اپنے حبیب خاتم الانبیاء ﷺ کو اس جانکاہ غم میں مبتلا نہ رکھتا، اس لیے میں اس کہانی کو ازاول تا آخر غلط سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔“ (»مطالعہ«: ۱۷۷-۱۷۴)

(جواب): ① اگر عقل ہی معیار ہے تو میرٹھی صاحب اور ان کے ہمنوا اس رافضی اور قرآن کریم میں (نعوذ باللہ) تحریف کے دعویٰ دار آدمی کو کیا جواب دیں گے جو قرآن کریم پر یہی اعتراض کر دے اور کہہ دے کہ: (نقل کفر کفر نہ باشد)

”میں قرآن میں مذکور یوسف علیہ السلام کا واقعہ غلط اور کسی کا اپنی طرف سے گھڑا ہوا سمجھتا ہوں، کیونکہ یہ عصمتِ انبیاء اور سنتِ الہی کے خلاف معلوم ہوتا ہے، وہ یوں کہ کسی نبی پر یا کسی ولی پر کبھی ناپارسائی کا کوئی الزام لگا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فوراً علی الاعلان سب کے برملا اس کی براءت کی ہے، جبکہ سورہ یوسف میں یہ بتایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی براءت کا برملا اعلان عزیز مصر کی بیوی نے اس وقت کیا، جب آپ چند سال تک قید کاٹ چکے تھے، پھر اس نے کہا تھا:

الصَّادِقِينَ ۝ (یوسف: ۵۱)

”اب حق آشکارا ہوا ہے، میں نے ہی اسے اس کے نفس کے بارے میں بہلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچے لوگوں میں سے ہیں۔“

پھر یوسف علیہ السلام کا یہ مقولہ ذکر کیا گیا ہے:

ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ۝ (یوسف: ۵۲)

”یہ (میری طرف سے کیا گیا تحقیق کا مطالبہ) اس لیے تھا کہ وہ (عزیز مصر) یقین کر لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس سے خیانت نہیں کی اور یقیناً اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کی تدبیر کو چلنے نہیں دیتا۔“

سنتِ الہی کے مطابق تو یوں ہونا چاہیے تھا کہ اسی وقت سب لوگوں کو سرِ عام یوسف علیہ السلام کی براءت سے آگاہ کیا جاتا، جیسا کہ مریم علیہا السلام کی گود میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے برملا سب لوگوں کے سامنے ان کی براءت کا اظہار کیا تھا اور سب لوگ اسی وقت ان کی پارسائی پر ایمان لے آئے تھے، لیکن یہاں مذکور ہے کہ کئی سال بعد سب لوگوں کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوئی تھی، بلکہ خود یوسف علیہ السلام نے اس امر کی ضرورت محسوس کی اور بادشاہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ پہلے اس کیس کی تحقیقات کروائیں تاکہ بادشاہ اور تمام لوگوں کو آپ علیہ السلام کی براءت کا

یقین ہو جائے اور کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔۔۔“

② جرتج راہب کے قصہ میں بھی ”علی الفور“ والی کوئی بات نہیں ہے، جس کا میرٹھی صاحب نے دعویٰ کیا ہے، بلکہ لوگوں نے عورت کے الزام پر یقین کر کے اس کے عبادت خانے کو مسمار کر دیا تھا اور اسے گالیاں بھی دی تھیں، صحیح بخاری ہی کے الفاظ ہیں:

فأتوه ، فكسروا صومعته ، وأنزلوه ، وسبوه ... ”لوگ اس کی طرف آئے ، اس کے عبادت خانے کو ڈھا دیا، اس کو باہر نکالا اور اسے گالی گلوچ کیا۔۔۔“ (صحیح بخاری: ۳۴۳۶)

اس واقعہ کو تو خود میرٹھی صاحب نے اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کیا ہے، اگر کوئی آدمی کہہ دے کہ ”اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نیک بندوں کو اس طرح کے الزام کی وجہ سے کوئی گزند پہنچنے سے پہلے ہی بری کر دیتا ہے، لیکن جرتج کے واقعہ کو میں غلط سمجھتا ہوں، کیونکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ لوگوں نے اس کا عبادت خانہ مسمار کر دیا تھا، اسے باہر نکال دیا تھا اور اسے گالی گلوچ بھی کی تھی، حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ علی الفور اس کی براءت کا اظہار فرماتا۔“ تو میرٹھی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

جو وہ جواب اپنے ہاں اس تسلیم شدہ واقعہ کا دیں گے، وہی حدیث اٹک کا ہم دے دیں گے۔

③ اگر کوئی منکر قرآن کہہ دے کہ ”میں قرآن میں مذکور مریم علیہا السلام کا واقعہ تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ لوگوں نے سیدہ مریم علیہا السلام پر بہتان رکھ دیا تھا کہ تیرے ماں باپ تو ایسے بدکار نہ تھے، تُو نے کیا کیا ہے؟؟؟“ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں ایسی بات ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کوئی نشانی ظاہر کر کے لوگوں کو مطمئن کر دے، اس لیے کہ ایسی بات کا ایک دفعہ کہہ دیا جانا بھی انبیاء و صلحاء کی عصمت و عظمت کے منافی ہے۔“

تو منکرین صحیح بخاری کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟؟؟ وہی ہمارا جواب سمجھ لیں!!!

④ قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت مذکور ہے اور ہر مسلمان اس کا اقرار ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی آزمائش کرتا ہے، نیز ہر ذی شعور آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جتنا کوئی انسان اللہ کے زیادہ قریب ہوگا، اتنی ہی اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے، تمام انبیاء و صلحاء مل کر نبی آخر الزمان ﷺ کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے، آپ کا چونکہ مقام و مرتبہ سب سے اونچا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی آزمائش بھی سخت کی گئی، لہذا دیگر انبیاء و صلحاء کے اس طرح کے واقعات کے نسبت اللہ تعالیٰ نے سیدہ

عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان کچھ دیر سے کیا، نیز اس میں بہت سی بلیغ حکمتیں پوشیدہ تھیں، جن کے تذکرے کا یہ مقام نہیں ہے۔

تنبیہ: الحمد للہ! میرٹھی صاحب کے صحیح بخاری کی حدیثِ افاک پر کیے گئے تمام اعتراضات کا ہم نے مفصل جواب دے دیا ہے، ان اعتراضات کے آخر میں خلطِ بحث سے کام لیتے ہوئے دس سے زائد صفحات خوانخواہ سیاہ کیے ہیں، کہتے ہیں: ”رہا یہ سوال کہ اس فرضی کہانی کا مصنف کون ہے اور وجہ تصنیف کیا تھی؟ تو اس کا جواب دینے سے قبل میں ان تینوں روایتوں کی اسناد پر بحث کروں گا۔۔۔“ اسناد پر اعتراضات کا تو ہم نے تفصیلی جواب شروع میں ہی اصولی اعتراضات اور ان کے جوابات کے ضمن میں دے دیا ہے، باقی میرٹھی صاحب نے خود یہ اعتراف بھی کر لیا ہے کہ ان کے نزدیک جو اس کہانی کا مصنف ہے، اس کا نام وہ نہیں جانتے، نہ معلوم پھر وہ انکل پچو سے کام کیوں لے رہے ہیں۔ رہی وجہ تصنیف تو اس میں انہوں نے نہایت بے بنیاد باتیں کی ہیں، جن کا ان کے موضوع، یعنی صحیح بخاری سے کوئی تعلق نہیں۔

لہذا ہم ان کی اس فضول کاوش کی طرف التفات نہیں کر رہے، حالانکہ وہاں بھی جابجا ان پر گرفت کی جاسکتی ہے، لیکن یہ سب کچھ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!



قارئین کرام! یہ جان کر آپ کو یقیناً دلی خوشی ہوگی کہ **السنة** نے اپنی عمر کا ایک سال مکمل کر لیا ہے، یہ سب کچھ اللہ رب العزت کے فضل اور آپ کی دعاؤں سے ممکن ہوا ہے، اس میں جو خوبیاں تھیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں اور جو خامیاں تھیں، وہ ہماری بشری لغزشوں کا نتیجہ تھیں، ہم نے علمی بے بضاعتی کے باوجود علم و تحقیق کا دامن نہیں چھوڑا، آئندہ بھی اسی معیار کو برقرار رکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز! جہاں آپ خود اس کے قاری ہیں، وہاں آپ کا یہ بھی اخلاقی فرض ہے کہ اس کے قارئین کی تعداد کو بڑھا کر اس کا رِخیر میں عملاً حصہ ڈالیں، لہذا اپنے عزیز و اقارب اور احباب و اصحاب کو اس کی ترغیب دیں۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ کی تفسیر

قارئین کرام! سورۃ القیامہ کی آیات (۱۶-۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو یہ تعلیم دی تھی کہ جبریل کے آپ کی طرف وحی کرنے کے وقت آپ بھول جانے کے اندیشے سے جلدی جلدی نہ پڑھا کریں، بلکہ جب جبریل وحی مکمل پہنچا چکیں تو آپ پڑھیں، وحی کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، وہ اسے ضائع نہیں ہونے دے گا۔

قرآن کریم کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں اور صحیح بخاری میں موجود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ان آیات کی یہی تشریح کرتی ہے، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین، سب نے اجماعی طور پر یہی تفسیر کی ہے، چودہ سو سال تک کسی مسلمان نے اس تفسیر کو غلط نہیں کہا، آپ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کوئی بھی تفسیر اٹھائیں، ان آیات کی یہی تفسیر آپ کو ملے گی، لیکن چودہ سو سال کے تمام مسلمانوں کو معاذ اللہ ”عقل و فہم سے بے بہرہ، بے وقوف اور نہایت غیر عاقلانہ طرز کار کے حامل“ قرار دے کر شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اس حدیث اور اس تفسیر پر بہت سے بے تنکے، جاہلانہ اور آوارہ اعتراضات کیے ہیں، بھلا کوئی اس سے پوچھتے کہ چودہ سو سال میں کیا کوئی بھی اتنی سوچ بوجھ والا انسان پیدا نہیں ہوا؟

در اصل یہ لوگ چاہتے ہیں کہ حدیث پر اعتراضات کر کے اس کی دینی حیثیت کو مشکوک بنا دیا جائے اور پھر قرآن کی من مانی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے اصل اسلام کو ختم کیا جائے اور اسلام کا لیل بھی قائم رہے۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ باطنی و رافضی صاحب قرآن کریم میں بھی عربیت کے لحاظ سے غلطیوں کے وجود کا دعویٰ دار ہیں (دیکھیں) «صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۷۳/۱، لیکن پھر بھی بعض جاہل لوگ انہیں ”مفسر قرآن“ سمجھتے ہیں اور ان کی نام نہاد تفسیر ”مفتاح القرآن“ کو بڑا علمی خزانہ سمجھتے ہیں۔

آئیے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر ساری امت کے اتفاق کے خلاف انہوں نے جو کاوش کی ہے، اس کا علمی، تحقیقی اور عقلی جائزہ لیتے ہیں:

اعتراض نمبر ① : ”ابوعوانہ راوی نے جس کا نام وضاح بن عبداللہ بشاری ہے،

یہ حدیث موسیٰ بن ابی عائشہ سے سنی تھی، موسیٰ بن ابی عائشہ کا بیان ہے کہ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے عبداللہ

ابن عباس نے سعید بن جبیر سے فرمایا تھا کہ دیکھو، میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ آغازِ امر میں حضرت جبرئیل کے ساتھ ایک ایک لفظ پڑھتے ہوئے ہونٹ ہلاتے تھے اور سعید ابن جبیر نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے کہا کہ دیکھو، میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جیسے عبد اللہ بن عباس نے مجھے اپنے ہونٹ ہلا کر دکھائے تھے، اس پر یہ بجا یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس نے رسول اللہ ﷺ کے مقدس لبہائے مبارک جبرئیل کے ساتھ ساتھ لفظ لفظ پڑھنے کی وجہ سے ہلتے ہوئے کب دیکھے تھے؟ جب سورۃ القیامہ نازل ہوئی ہے تو ابن عباس پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، حضور اکرم ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی ہے تو ابن عباس اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے، انہیں ہوشمند ہونے کے بعد پہلی بار حضور اکرم ﷺ کو دیکھنے کا موقع ذی قعدہ سات ہجری میں میسر ہوا تھا، جب آپ عمرۃ القضا کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے اور اس روایت کے بموجب رسول اللہ ﷺ کا وحی اخذ کرتے ہوئے ہونٹوں کو ہلانا نبوت کے ابتدائی دور کی بات ہے، جسے عبد اللہ بن عباس نے یقیناً نہیں دیکھا، کیونکہ وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، پھر عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر سے یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ اَنَا أَحَرَّ كَهْمَا لَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْرُكُهُمَا ... (میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے ہونٹ ہلایا کرتے تھے)، ہرگز نہیں، ہمیں یقین ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس نے سعید بن جبیر سے یہ نہیں کہا تھا اور غالباً سعید بن جبیر نے بھی موسیٰ بن ابی عائشہ سے یہ فضول اور غلط بات نہیں کہی ہوگی۔۔۔ بلکہ یہ خود موسیٰ بن ابی عائشہ کا ہی طبعزداد اضافہ ہے۔۔۔» («مطالعہ»: ۱۸/۱۹)

(جواب): قارئین کرام! یہ اعتراض حدیث اور اصول حدیث سے ناواقفیت یا محض ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔

① بات اتنی سی ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ حدیث اس وقت نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی تھی، بلکہ بعد میں نبی کریم ﷺ نے ان کو سورۃ القیامہ کی تفسیر سمجھاتے ہوئے اپنا یہ واقعہ سنایا تھا اور وہ کیفیت دکھائی تھی، جسے آپ ان آیات کے نزول سے پہلے اختیار کیا کرتے تھے۔

مستخرج ابی نعیم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ صریح الفاظ ہیں: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْرُكُ شَفْتَهُ. ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا ہونٹ ہلاتے ہوئے

دیکھا۔“ (المسند المستخرج على صحيح الامام مسلم لأبي نعيم الأصبهاني: ٦٨/٢، وسنده صحيح)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ: یہی اعتراض نقل کر کے جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: لکن يجوز أن يكون النبي صلى الله عليه وسلم أخبره بذلك بعد أو بعض الصحابة أخبره أنه شاهد النبي صلى الله عليه وسلم ، والأول هو الصواب ، فقد صريحاً في مسند أبي داود الطيالسي ...

”ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں خود ان کو یہ بیان کیا ہو یا کسی اور صحابی نے ان کو بتایا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، لیکن پہلی بات (کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان کو بعد میں بتا دیا تھا)، کیونکہ مسند ابی داؤد طیالسی میں یہ صریح طور پر ثابت ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ٢٩/١)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما مفسر قرآن ہیں اور تفسیر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے حاصل کی ہے، کیا یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے کہ آپ ﷺ نے ان آیات کی تفسیر بتاتے وقت ان کو وہ کیفیت بتادی تھی؟

② اگر کوئی اس بات کو نہ مانے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کیفیت بتائی تھی، تو بھی اس حدیث میں کوئی عیب و قدح اور ضعف پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ صحابہ کرام جب ایسی حدیث بیان کریں جو انہوں نے ڈائریکٹ نبی کریم ﷺ سے سنی نہ ہو تو وہ لازماً کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کر رہے ہوتے ہیں اور اسے اصطلاح محدثین میں ”مرسل صحابی“ کہتے ہیں اور یہ عام ”مرسل“ حدیث کی طرح ”ضعیف“ نہیں، بلکہ محدثین کے نزدیک مقبول ہے، حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ (۱) فرماتے ہیں:

ثم أنا لا نعد في أنواع المرسل ونحوه ما يسمى في أصول الفقه مرسل الصحابي ، مثل ما يرويه ابن عباس وغيره من أحداث الصحابة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يسموه منه ، لأن ذلك في حكم الموصول المسند ، لأن روايتهم عن الصحابة ، والجهالة بالصحابي غير قاذحة ، لأن الصحابة كلهم عدول ...

”پھر یہ بھی یاد رہے کہ ہم (محدثین) اس حدیث کو مرسل وغیرہ کی اقسام میں شمار نہیں کرتے جسے اصول فقہ میں مرسل صحابی کا نام دیا جاتا ہے، جیسا کہ وہ احادیث جن کو سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان جیسے دوسرے کم سن صحابہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں، حالانکہ انہوں نے وہ احادیث آپ ﷺ سے نہیں سنی ہوتیں، (ہم ان کو ضعیف قرار نہیں دیتے) کیونکہ یہ موصول اور مسند حدیث کے حکم میں ہوتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ کم سن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (دیگر کبار) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی روایت کرتے ہیں اور صحابی کا معلوم نہ ہونا

(حدیث کی صحت میں) عیب نہیں، اس لیے کہ سارے صحابہ عادل ہیں۔“ (مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۷۱)

حافظ نووی رحمہ اللہ (م ۶۷۲ھ) لکھتے ہیں: اَنَّ مَرْسِلَ الصَّحَابِيِّ حِجَّةٌ عِنْدَ جَمِيعِ الْعُلَمَاءِ ...

”بلاشبہ مرسل صحابی سب علمائے کرام کے نزدیک حجت ہے۔“ (شرح صحیح مسلم: ۱۹۷/۲)

نیز لکھتے ہیں: اَنَّ مَرْسِلَ الصَّحَابِيِّ اِذَا لَمْ يَعْرِفِ الْمَحْذُوفُ يَكُونُ حِجَّةً ...

”یقیناً جب محذوف راوی معلوم نہ ہو سکے تو (بھی) مرسل صحابی حجت ہوتی ہے۔“

(شرح صحیح مسلم: ۱۹۸/۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اَنَّ الْجُمْهُورَ جَعَلَهُ حِجَّةً . ”بے شک جمہور علمائے

کرام نے اسے (مرسل صحابی کو) حجت بنایا ہے۔“ (النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۵۸۵/۲)

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض اصطلاحات محدثین سے جہالت کا کرشمہ ہے، اور ان کا یہ کہنا نہایت فضول اور بے جا ہے کہ: ”ابن عباس نے واقعاً یہ بات کسی سے بھی نہیں سنی، نہ خود حضور اکرم ﷺ سے، نہ کسی صحابی سے، ورنہ وہ ضرور بتاتے کہ مجھے یہ بات فلاں سے معلوم ہوئی تھی۔“ (»مطالعہ«: ۱۹/۱: ۲۰)

جاہلی کلابازیاں : قارئین کرام! آئیے سب مسلمانوں کے نزدیک قابل

احترام بزرگ ہستیوں کو ”عقل و فہم سے بے بہرہ“ اور ”بے وقوف“ قرار دینے والے صاحب کی اپنی عقلی کیفیت ملاحظہ فرمائیں کہ وہ خود کیسے جہالت اور بے وقوفی میں کلابازیاں کھاتے پھرتے ہیں:

آپ اعتراض نمبر ① میں میرٹھی صاحب کے یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں کہ: ”یہ خود موسیٰ بن ابی عائشہ کا ہی طبع زاد اضافہ ہے۔۔۔“ لیکن ان کی کلابازی دیکھیں کہ اگلے ہی صفحہ پر لکھتے ہیں:

”تو کیا سعید بن جبیر نے یہ غلط بیانی کر ڈالی تھی اور یہ قصہ گھڑ لیا تھا؟ نہیں، وہ نیک و ثقہ شخص تھے، کذاب و دروغ باف نہ تھے، بات یہ ہوئی کہ کسی شخص نے حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کر کے سعید بن جبیر سے یہ حدیث بیان کر دی تھی، سعید نے غور و فکر سے کام نہ لیا، اس شخص پر اعتماد کر کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کر کے یہ حدیث روایت کر ڈالی۔“ (»مطالعہ«: ۲۰/۱)

دیکھا آپ نے کہ پہلے موسیٰ بن ابی عائشہ پر الزام دھرا کہ انہوں نے اپنی طرف سے اسے گھڑا تھا، حالانکہ وہ نہایت ثقہ و عادل تابعی تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کو دیکھنے سے اللہ یاد آجاتا ہے (تہذیب الکمال:) لیکن ”دروغ گورا حافظہ نہ باشد“ کا مصداق بن کر ایک ہی صفحہ بعد پینتر بدلا اور خود ساختہ

مفروضہ کے تحت کسی فرضی شخص کو مورد الزام ٹھہرا دیا ہے۔

یہ بھی ایک الگ بحث ہے کہ خود انہی کی ذکر کردہ حدیث بخاری میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حدیث سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ڈائریکٹ سنی تھی، جیسا کہ ہم اعتراض نمبر ⑤ کے جواب میں تفصیلاً ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ!

اسی پر بس نہیں، ابھی گرگٹ کی طرح ان کا تیسرا رنگ بھی دیکھیں کہ یہاں تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر تابعی ہیں، ان نیک وثقہ اور جھوٹ سے مبرا قرار دے رہے ہیں، لیکن اسی کتاب میں دوسری جگہ اسی نیک وثقہ اور عظیم المرتبت امام کے بارے میں ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

”سعید (بن جبیر) نے بے سوچے سمجھے اسے روایت کر دیا، کیونکہ ان راویانِ اخبار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کفی بالمرء کذباً أن يحدث بكل ما سمع (آدمی کو (تباہی کے لیے) یہی جھوٹ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کر دے) کی پرواہ نہ تھی، بس اپنے علامہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے روایات بیان کرتے رہتے تھے۔“ (مطالعہ: ۳۳۰/۲)

قارئین کرام! ایمان و انصاف سے بتائیں کہ جس شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی پرواہ نہ ہو اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث اپنے علامہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بیان کرتا ہو، وہ کیسا ثقہ و نیک ہے؟ یہ ہیں اس عظیم تابعی اور ثقہ امام کے بارے میں ان کے تاثرات، جن کو حافظ ذہبی جیسا ناقدِ رجال شخص بہت سے القابات سے نوازتے ہوئے لکھتا ہے: الامام، الحافظ، المفسر، الشهيد.... أحد الأعلام،

روى عن ابن عباس، فاكثرو وجود.... قرأ القرآن على ابن عباس... (آپ) امام، حافظ، مفسر، شہید۔۔۔ جلیل القدر علمائے اسلام میں سے ایک ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ نے بہت زیادہ روایات کی ہیں اور بہت عمدہ کی ہیں۔۔۔ انہوں نے قرآن کریم بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی پڑھا تھا۔“ (سير اعلام النبلاء: ۳۵۵/۷)

ہم نے مقدمہ میں ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ صاحب ایک ایک محدث کی شان میں گستاخی کر کے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور آپ ان کا یہ فعل شنیع ملاحظہ کرتے ہی رہیں گے۔

”سعید بن جبیر نے بہت سی حدیثیں حضرت عبداللہ بن عباس : اعتراض نمبر ⑤ :

سے براہِ راست سنی تھیں اور بہت سی حدیثیں دیگر اشخاص نے انہیں ابن عباس کی طرف منسوب کر کے بتائی

تھیں، سعید نے ہر دو قسم کی حدیثوں کی روایت کی ہے، مگر جب وہ پہلی قسم کی کوئی حدیث روایت کرتے جسے موصوف نے براہ راست ابن عباس سے سنا ہوتا تو حدثنیٰ ابن عباس یا سمعت ابن عباس یا أخبرنی ابن عباس کہہ کر بیان کرتے تھے اور دوسری قسم کی کوئی حدیث روایت کرتے ہوئے یا تو اس شخص کا نام بتاتے، مثلاً حدثنیٰ عکرمہ عن ابن عباس یا حدثنیٰ مجاہد عن ابن عباس یا اس شخص کا نام ذکر نہ کرتے، بس عن ابن عباس کہہ دیتے، یہ حدیث بھی اسی قسم کی ہے، اس کے کسی بھی طریق میں سعید بن جبیر سے کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ سعید نے یہ قصہ براہ راست حضرت ابن عباس سے سنا تھا، ہر طریق کی اسناد میں سعید بن جبیر عن ابن عباس ہے۔۔۔ لیکن کسی بھی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ سعید نے حدثنیٰ یا أخبرنی یا سمعت یا أنبأنی ابن عباس کہا ہو، ہر طریق کی اسناد میں ہمیں عن ابن عباس ملتا ہے۔“ (مطالعہ: ۲۰۸: ۲۱)

(جواب: ۱) آئیے! اگر منکرین حدیث کو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ”یہ قصہ براہ راست“ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سننے پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ ”کسی طریق“ میں نظر نہیں آیا تو ہم دکھلا دیتے ہیں، وہ ذرا اپنی آنکھوں سے انکار حدیث کی عینک اتار دیں اور میرٹھی صاحب کی ہی کتاب کھول کر صفحہ نمبر ۱۷ نکالیں اور ان ہی کی ذکر کردہ حدیث پڑھ لیں، انہی کے ذکر کردہ ”طریق“ میں یہ الفاظ موجود ہیں:

وقال سعيد : أنا أحرّ كهما لك كما رأيت ابن عباس يحزّ كهما ...

”سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے (اپنے شاگرد موسیٰ بن ابی عائشہ رضی اللہ عنہ سے) فرمایا، میں اسی طرح اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دے رہا ہوں، جس طرح میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“ مزے کی بات یہ ہے کہ خود میرٹھی صاحب یہی بات صفحہ نمبر ۱۸ پر ذکر کر چکے ہیں۔

پھر مسند احمد میں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں: فقال لي ابن عباس ...

”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے فرمایا۔۔۔۔“ (مسند الامام احمد: ۳۴۳/۱، وسندہ صحیح)

کیا اب بھی یہ واضح نہیں ہوا کہ اس حدیث کو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے براہ راست سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا تھا، درمیان میں کوئی واسطہ نہ تھا؟

(۲) کوئی ہمیں بھی بتائے کہ میرٹھی صاحب کو کس ”وجی“ کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ سعید بن

جبیرؓ کبھی واسطہ گرا کر استاذ کا نام لیے بغیر سیدنا ابن عباسؓ سے بیان کر دیتے تھے، حالانکہ انہوں نے وہ احادیث سیدنا ابن عباسؓ سے سنی نہیں ہوتی تھیں، کسی محدث نے کہیں ایسا ذکر کیا ہو؟ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ محدثین کو اس کا علم ہوتا، منکرین حدیث کو بھلا حدیث اور راویان حدیث کی کیا معرفت؟

③ ہاں! اسے شیطانی وحی یقیناً قرار دیا جاسکتا ہے، وہ کیسے؟ اس لیے کہ جھوٹ شیطان ہی کا شیوہ ہے، عکرمہ اور مجاہدؓ کو امام سعید بن جبیرؓ کا استاذ قرار دینا کائنات کا بدترین جھوٹ ہے، بلکہ امام مجاہدؓ تو ساتھی ہونے کے ساتھ ساتھ سعید بن جبیرؓ کے شاگرد بھی ہیں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سعید بن جبیرؓ حدیثی مجاہد عن ابن عباسؓ کہیں؟

سنن ابی داؤد (۲۴۳۸) اور دیگر کتب حدیث میں مجاہدؓ تو سعید بن جبیرؓ سے حدیث بیان کر رہے ہیں، لیکن کسی حدیث میں امام سعید بن جبیرؓ مجاہدؓ یا عکرمہؓ سے بیان نہیں کر رہے، نیز کسی محدث نے عکرمہ اور مجاہدؓ کو سعید بن جبیرؓ کے اساتذہ میں ذکر نہیں کیا، اس کے برعکس مجاہدؓ کے اساتذہ میں امام سعید بن جبیرؓ کو امام سعید بن جبیرؓ کے شاگردوں میں مجاہدؓ کو ذکر کیا گیا ہے، اگر صرف حافظ مزنیؓ کی کتاب تہذیب الکمال کو ہی دیکھ لیا جاتا تو استاذوں، شاگردوں کا پتا چل جاتا اور اتنی بڑی جہالت و حماقت سے واسطہ نہ پڑتا، مگر صحیح بخاری سے نفرت نے ان کو اندھا کر دیا ہے، سوچنے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے!!!

③ حدیثی یا سمعت یا أخبرنی کے الفاظ کی شرط صرف ”مُس“ راویوں کے لیے لگائی جاتی ہے کہ جب تک وہ ان الفاظ کے ساتھ حدیث بیان نہ کریں، ان کی حدیث قبول نہیں ہوتی۔

حافظ ابن حجرؓ لکھتے ہیں: فحكم من ذكر من رجاله بتدليس أو ارسال أن تسبر أحاديثهم الموجودة عنده بالعننة، فان وجد التصريح بالسماح فيها اندفع الاعتراض وألا فلا . ”پس حدیث کے جو راوی تدلیس یا ارسال کے ساتھ موصوف ہوں، ان (کی احادیث) کا حکم یہ ہے کہ جو احادیث ”عن“ کے ساتھ ہوں، ان کو پرکھا جائے، اگر ان میں سماع کی تصریح مل جائے تو اعتراض ختم ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔“ (هدية الساری مقدمة فتح الباری: ۳۸۲)

جب کہ امام سعید بن جبیرؓ قطعاً ”تدلیس“ یا ”ارسال کثیر“ کے مرتکب نہ تھے، لیکن نہ جانے ان نام نہاد سکارلز نے کون سی کتاب میں پڑھ لیا ہے کہ ہر راوی سے سماع کی تصریح کا مطالبہ کیا جائے اور کہا جائے کہ

اس نے کہیں بھی حدثنی یا سمعت یا أخبرنی نہیں کہا؟
کوئی میرٹھی ہمیں بتائے کہ ان کے اس اصول کے مطابق کتنی احادیث بچیں گی، جن میں پوری سند سماع کی تصریح پر مشتمل ہے؟ یہ محض حدیث و محدثین دشمنی کا شاخسانہ ہے۔

اعتراض نمبر ③ : ”علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ سعید بن جبیر کی بہ نسبت عکرمہ

اور مجاہد حضرت عبداللہ بن عباس سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں اور ان کے ملازم صحبت رہے ہیں اور بھی بہت سے بندگانِ خدا نے ابن عباس سے حدیثیں اور آیاتِ قرآن کی تفسیریں سنی ہیں، لیکن سعید بن جبیر اس حدیث کی روایت میں متفرد ہیں، ان کے علاوہ کسی نے بھی ابن عباس سے اس قصہ کی روایت نہیں کی، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابن عباس نے یہ قصہ بیان نہیں کیا تھا، کسی نے خواخواہ اسے ابن عباس کی طرف منسوب کر کے سعید بن جبیر سے بیان کر دیا تھا اور سعید نے اس پر اعتماد کر کے اس کا نام بھی ذکر نہیں کیا اور بس ابن عباس کی طرف منسوب کر کے اس کی روایت کر دی۔“ (»مطالعہ«: ۲۷۸)

جواب: ① قارئین کرام! انصاف سے بتائیں کہ اگر ایک استاذ سے کئی شاگرد

پڑھتے ہوں تو کیا سب شاگرد ایک ہی جیسا علم حاصل کرتے ہیں، خصوصاً جبکہ موجودہ کلاس سسٹم نہ ہو، موجودہ نظام میں بھی سب شاگرد استاذ سے یکساں استفادہ نہیں کرتے، چہ جائیکہ اس دور میں جب ہر کوئی اپنے طور پر کسی استاذ سے علم حاصل کرتا تھا، واضح بات ہے کہ یہ اعتراض انتہائی فضول ہے۔

کیا سب احادیث سب صحابہ نے بیان کی ہیں، اب صحیح بخاری کی پہلی حدیث کو ہی لیں، جسے میرٹھی صاحب یقیناً صحیح سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے چھیڑا تک نہیں، بلکہ پانچویں حدیث پر اعتراض کیا ہے۔

یہ حدیث صحابہ کرام میں سے صرف سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے، کیا اس شخص کی بات درست ہوگی جو میرٹھی صاحب کی طرح یہ راگ الا اپنے لگے کہ:

”یہ حقیقت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نسبت سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابن عباس، سیدہ

عائشہ۔۔۔ رضی اللہ عنہا رسول کریم ﷺ سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں اور ان کے ملازم صحبت رہے ہیں اور بھی بہت سے صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں، لیکن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس کی حدیث کی روایت میں متفرد ہیں، ان کے علاوہ کسی صحابی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کی روایت نہیں کی، اس لیے میں

سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث بیان نہیں کی۔۔۔“

② حدیث کو پرکھنے کے لیے اصول محدثین کے ہی لاگو ہوں گے، محدثین میں سے کسی نے اس وجہ سے اس حدیث کو رد نہیں کیا، انکار حدیث کے علمبرداروں کو یہ حق کس نے دیا ہے؟ خود لکھتے ہیں:

”محدثین کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہے جس کی اسناد متصل ہو اور راوی سب کے سب ثقہ وضابط ہوں اور اس کی اسناد یا متن میں نہ کوئی شذوذ ہو، نہ کوئی علت ہو۔“ (مطالعہ: ۲۲/۸)

یہ تعریف خود میرٹھی صاحب نے ذکر کی ہے، اب قارئین ہی بتائیں کہ کیا اس میں یہ شرط موجود ہے کہ راوی کے دوسرے سب ساتھی بھی وہی حدیث بیان کریں تو تسلیم ہوگی؟

اعتراض نمبر ④: ”یہ تو اس میں اسناد کے لحاظ سے خامی ہے کہ اس کی اسناد متصل نہیں، بلکہ فی الواقع منقطع ہے، رہا اس کا متن تو اس میں دوزبردست خرابیاں ہیں، اول یہ کہ اس کی رو سے ضمیر غائب جو ان آیات میں سات بار آئی ہے لا تحرك به لسانك لتعجل به ☆ ان علينا جمعه وقرآنه ☆ فاذا قرأناه فاتبعه قرآنه ☆ ثم ان علينا جمعه وقرآنه ☆ قرآن کی طرف راجع ہے، حالانکہ سابقہ آیات میں قرآن کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کی طرف ان ضمیروں کا راجع ہونا درست ہو، قرآن کی طرف یہ ضمیریں راجع ماننے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے، لفظی ہو یا معنوی اور یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۲۷۸-۲۷۹)

جواب: قارئین کرام! صحیح بخاری کی حدیث میں اسناد کے لحاظ سے جو ”خامیاں“ انہوں نے بیان کی تھیں، ان کا تجزیہ ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے، فیصلہ آپ پر ہے، آئیے اب ان کی طرف سے متن میں بیان کی گئی پہلی ”خرابی“ کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ منکرین حدیث کی عقل کی خرابی ہے یا (معاذ اللہ) حدیث کے متن کی۔

① جب ہم نے میرٹھی صاحب کی طرف سے کئے گئے اعتراض رفع کر کے اس کی سند کو بالکل صحیح ثابت کر دیا ہے تو ضمیر کے غلط لوٹنے کا اعتراض ہم پر نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ پر ہے، کوئی مسلمان یہ جرات نہیں کر سکتا کہ آپ ﷺ کی بات باسند صحیح پہنچ جانے کے بعد ایسے اشکال پیش کرے۔

② آج تک کے تمام مسلمان مفسرین سورۃ القیامہ کی تفسیر میں اس حدیث کو ذکر کرتے رہے ہیں، اگر میرٹھی صاحب کے ذہن میں آنے والا اشکال کوئی علمی حیثیت رکھتا ہوتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین

اور ائمہ دین و محدثین کو ضرور معلوم ہوتا، وہ تو سب اس ضمیر کا مرجع قرآن کریم ہونا ثابت کرتے رہے ہیں، اگر یقین نہ آئے تو تفاسیر کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔

درحقیقت یہ لوگ اس کاوش کے درپردہ سب اسلاف امت کی کردار کشی چاہتے ہیں، جیسا کہ وہ صریح طور پر بھی ان کو ”عقل و فہم سے بے بہرہ“ کہہ کر اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

③ رہا قرینہ کا سوال تو علامہ آلوسی لکھتے ہیں: وَالضَّمِيرُ لِلْقُرْآنِ لِدَلَالَةِ سِيَاقِ الْآيَةِ نَحْوُ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”یہ ضمیر قرآن کریم کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس پر دلالت کر رہا ہے، جیسا کہ سورۃ القدر کی پہلی آیت میں بھی یہی ضمیر ہے۔۔۔“ (تفسیر روح المعانی)

علامہ ابن جزئی لکھتے ہیں: الضَّمِيرُ فِي بَعْضِ آيَاتِ الْقُرْآنِ دَلَّتْ عَلَى ذَلِكَ قَرِينَةُ الْحَالِ ... ”بہ میں ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹی ہے، قرینہ حال اس پر دلالت کرتا ہے۔“ (تفسیر الکلبی)

یعنی آپ ﷺ اس وقت وحی کو جلدی جلدی پڑھ رہے تھے، اسی حالت میں یہ فرمان باری تعالیٰ نازل ہو گیا، آپ ﷺ کو تو معلوم ہو گیا کہ ان آیات میں ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے، پھر آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو بھی حدیث کے ذریعے بتا دیا کہ کہیں اس کے بارے میں جھنجھلاہٹ کا شکار نہ ہوں۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کوئی خطیب تقریر کر رہا ہو اور دوران تقریر ہی وہ کسی کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ دے کہ ”یہ مجھے دو۔“ اب سامنے بیٹھنے والوں کو تو اس بات کی سمجھ آ جائے گی اور ”یہ“ والی ضمیر کا مرجع بھی معلوم ہو جائے گا، لیکن بعد میں کوئی آدمی اس تقریر کی آڈیو ریکارڈنگ سن رہا ہو تو جب تک اسے صورت حال بتانہ دی جائے، سمجھ نہ پائے گا کہ اس ضمیر کا مرجع کیا ہے، بلکہ اپنے ذہن کے مطابق کبھی کچھ سوچے گا اور کبھی کچھ، اسی صورت حال سے بچنے کے لیے ان آیات کا سبب نزول رسول اللہ ﷺ نے بیان فرما دیا تھا، لیکن یہ وضاحت (حدیث) منکرین حدیث کو بھاتی نہیں اور وہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

④ اگر میرٹھی کمپنی کی سمجھ میں اب بھی بات نہیں آئی تو سورۃ القدر کی پہلی آیت:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔“

میں ضمیر کا مرجع بتائیں، پیچھے قرآن مجید کا ذکر نہیں ہے، بلکہ سورت شروع ہی ہو رہی ہے، جس طرح وہ اس آیت میں ضمیر کا مرجع قرآن کریم ثابت کریں گے، اسی طرح ہم اس آیت میں ثابت کر دیں گے۔

اعتراض نمبر ⑤ : ”دوم یہ کہ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ کو

اس معنی و مطلب پر حمل کیا جائے جو اس حدیث میں مذکور ہے تو اسے کچھلی اور بعد کی آیتوں سے کوئی ربط نہیں رہتا اور قرآن تو بہت بڑی چیز ہے، ایسی بے ربطی تو کسی عقلمند انسان کے کلام میں بھی نہیں ہو سکتی۔۔۔

لہذا اصول حدیث کی رو سے یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اگرچہ امام بخاری اور امام مسلم نے اس کی تخریج فرمائی ہے۔“ (»مطالعہ«: ۲۲/۱)

(جواب): ہم نے میرٹھی صاحب کو ایسے ہی رافضی قرار نہیں دے دیا، بلکہ دلائل و شواہد کی

روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے، ان کا یہ اعتراض بھی رافضیت کا پروردہ ہے، ہم ہی نہیں کہتے، تقریباً آٹھ سو سال پہلے علامہ رازی (۶۰۶ھ) لکھ گئے ہیں:

زعم قدماء الروافض أن هذا القرآن قد غیر و بدل وزید فیہ ونقص عنه ، واحتجوا علیہ بأنہ لا مناسبة بین هذه الآية وبين ما قبلها ، ولو كان هذا الترتیب من اللہ تعالیٰ لما كان الأمر كذلك ...

”قدیم رافضیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کریم (نعوذ باللہ!) تغیر و تبدل اور کمی و بیشی کا شکار ہو گیا ہے، اس پر دلیل انہوں نے یہی پیش کی ہے کہ اس آیت اور پہلی آیات میں کوئی ربط نہیں ہے، اگر یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔۔۔“ (التفسیر الکبیر للرازی: ۱۹۷/۱۶)

صاحب تفسیر اللباب لکھتے ہیں: قال بعض الرافضة عدم مناسبتها لما قبلها يدل على تغيير القرآن .. ”بعض رافضی لوگوں نے کہا ہے کہ ان آیات کا پہلی آیات سے ربط نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں تغیر و تبدل ہو چکا ہے۔“ (تفسیر اللباب: ۱۰۲/۱۶)

پھر انہوں نے کئی طرح سے ثابت کیا ہے کہ یہ آیات اس حدیث میں موجود تفسیر کے مطابق بے ربط نہیں ہیں، بلکہ ان میں کمال درجہ کا ربط ہے، مثلاً علامہ رازی لکھتے ہیں: وهذا كما أن المدرّس اذا كان يلقي على تلميذه شيئاً ، فأخذ التلميذ يلتفت يميناً وشمالاً ، فيقول المدرّس في أثناء ذلك المدرّس : لا تلتفت يميناً وشمالاً ، ثم يعود الى المدرّس ، فاذا نقل ذلك المدرّس مع هذا الكلام في أثناءه ، فمن لم يعرف السبب يقول : ان وقوع تلك الكلمة في أثناء ذلك المدرّس غير مناسب ، لكن من عرف الواقعة علم من أنه حسن الترتيب ...

”یہ اسی طرح ہے کہ استاذ اپنے شاگرد کو کچھ سمجھا رہا ہو، لیکن شاگرد دائیں بائیں جھانکنے لگے، استاذ

دورانِ سبق ہی کہہ دے کہ دائیں بائیں مت جھانکو! جب یہ الفاظ بھی سبق کے ساتھ نقل (ریکارڈ) ہو جائیں تو جس آدمی کو سبب کا علم نہ ہوگا، وہ کہے گا کہ اس سبق کے درمیان یہ الفاظ بے ربط ہیں، لیکن جس کو واقعہ کا علم ہوگا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ (بے ربطی نہیں، بلکہ) حسن ترتیب ہے۔۔۔“ (تفسیر الرازی: ۱۰۲/۸۶)

اور بھی بہت سے ربط بیان کیے گئے ہیں، تفصیل کے لیے کتبِ تفسیر کی طرف مراجعت فرمائیں!

نکتہ لطیفہ : ایک نکتہ یہ بھی یاد رہے کہ رافضیوں کو قرآن کریم میں بے ربطی اسی لیے نظر

آئی کہ وہ اس کی تفسیر حدیث سے نہیں کرتے تھے، اگر اس حدیث کو مانتے تو یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ جاتی اور وہ انکارِ قرآن سے بچ جاتے، معلوم ہوا کہ انکارِ حدیث انکارِ قرآن ہے، جو آج بھی ہو رہا ہے۔

تنبیہ : اعتراضات سے فارغ ہو کر میرٹھی صاحب نے انکارِ حدیث کی روشنی میں سورۃ

القیامہ کی ان آیات کی ”تفسیر“ کی ہے، جو کہ بالکل باطل اور بودی ہے، لیکن ہم ابھی اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے، کیونکہ جب بفضل اللہ ہم نے صحیح بخاری کی اس حدیث پر وارد کیے گئے ان کے تمام اعتراضات کے کافی و شافی جوابات دے دیئے ہیں تو ان کی ”تفسیر“ خود بخود ہی مردود ہو جائے گی، دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہمارے موضوع، یعنی صحیح بخاری سے متعلق نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ ابھی تک ان کی تفسیر نایاب ہے، امید ہے کہ عنقریب وہ منظر عام پر آ جائے گی، اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو ہم ان کی اس کتاب ”مفتاح القرآن“ کا ایک مستقل جواب لکھیں گے۔ انشاء اللہ!



الوداع

غلام مصطفیٰ ظہیر الرحمن پوری، حافظ ابو یحییٰ نور پوری

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ موسیٰ بن وردان سے فرماتے ہیں: **أَلَا أَعْلَمُكَ يَا ابْنَ أَخِي شَيْئًا عَلَّمَنِيهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقُولُهُ عِنْدَ الْوَدَاعِ؟ قُلْتُ بَلَى، قَالَ: قُل: أَسْتَوْدِعُكُمْ اللَّهُ الَّذِي لَا تَضِيعُ وَدَائِعُهُ.** ”اے بھتیجے! کیا میں تمہیں وہ دعا نہ سکھاؤں جو مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی کہ میں (کسی کو) الوداع کرتے وقت کہوں؟ (موسیٰ بن وردان کہتے ہیں) میں نے عرض کی، جی ضرور، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تو کہا کہ: **أَسْتَوْدِعُكُمْ اللَّهُ الَّذِي لَا تَضِيعُ وَدَائِعُهُ.** ”میں تمہیں اس اللہ کے حوالے کرتا ہوں، جس

کی امانتیں ضائع نہیں ہوتیں۔“ (مسند الامام احمد: ۴۰۳/۲، عمل اليوم والليلة لابن السني: ۵۰۴، واللفظ له، وسنده حسن)

کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

امام الآجری رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ) فرماتے ہیں: فكل من رد سنن رسول الله صلى الله عليه وسلم وسنن أصحابه، فهو ممن شاقق الرسول وعصاه، وعصى الله عز وجل بتركه قبول السنن، ولو عقل هذا الملحد وأنصف من نفسه، علم أن أحكام الله عز وجل وجميع ما تعبد به خلقه، إنما تؤخذ من الكتاب والسنة، وقد أمر الله عز وجل نبيه صلى الله عليه وسلم أن يبين لخلق ما أنزل عليه مما تعبد بهم به، فقال جل ذكره: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لُتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل: ۴۴)، فقد بين لأمته جميع ما فرض عليهم من جميع الأحكام وبين لهم أمر الدنيا وأمر الآخرة وجميع ما ينبغي أن يؤمنوا به، ولم يدعهم جهلة لا يعلمون، حتى أعلمهم أمر الموت والقبر، وما يلقي فيه المؤمن، وما يلقي فيه الكافر، وأمر الحشر والوقوف، وأمر الجنة والنار، حالاً بعد حال، يعرفه أهل الحق... ”جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی سنت کو ٹھکرائے گا، وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کے مخالف اور نافرمان ہیں، نیز وہ سنتوں کو چھوڑنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا بھی نافرمان ہو گیا ہے، اگر یہ بے دین شخص عقل کرے اور خود انصاف کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اور مخلوق جو اس کی عبادت بجالاتی ہے، اس کے تمام طریقے کتاب و سنت سے ہی اخذ کیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم بھی فرمایا ہے کہ وہ اس کی مخلوق کے لیے اس کے نازل کردہ بعدی فرامین کی توضیح کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لُتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل: ۴۴) (اور ہم نے آپ کی طرف ذکر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف نازل کردہ وحی کی وضاحت کریں اور تاکہ وہ غور و فکر کریں)، لہذا رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے تمام وہ احکام بیان کر دیئے ہیں جو ان پر مقرر کیے گئے ہیں، نیز ان کے لیے دنیا و آخرت کا معاملہ بیان کر دیا ہے اور تمام وہ چیزیں بھی جن پر ایمان لانا ضروری ہے، ان کو بے علم جاہل نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ ان کو موت اور قبر کے حالات کی بھی خبر دی ہے، مؤمن و کافر کے انجام، حشر و قوف (روز قیامت حساب کے لیے اجتماع اور قیام) اور جنت و جہنم کے لمحہ بہ لمحہ حالات بھی بیان کر دیئے ہیں، جن کو اہل حق جانتے ہیں۔“ (الشریعة للآجری: ۳۵۰-۳۵۱)



www.AhleSunnatPk.com